مسلمان اقوام
کے زوال کے اسباب

الحاج ڈاکٹر عبدالکریم جرمانوس

مسلمان اقوام کے زوال کے اسباب

مترجم

پروفیسر محمد سرور

سندھ ساگر اکادمی لاہور

طابع ناشر محمد صدیق نومبر ۱۹۵۵ء
مطبع استقلال پریس لاہور قیمت ایک روپیہ ۱۲ ار

فہرس

مقدمہ

تعارف

"مسلمان اقوام کے زوال کے اسباب" کے مصنف ہنگری کے مشہور مستشرق پروفیسر الحاج ڈاکٹر عبدالکریم جرمانوس ہیں۔ آپ اس وقت ہنگری کی یونیورسٹی بوڈاپسٹ میں علوم شرقیہ کے پروفیسر ہیں۔ موصوف متحدہ ہند کے زمانے میں ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کی یونیورسٹی شانتی نکیتن میں رہ چکے ہیں، اس کے بعد آپ جامعہ ملیہ دہلی میں آئے، اور وہاں اپنے اسلام قبول کرنے کا اعلان فرمایا۔ بعدازاں آپ حج کو تشریف لے گئے۔ وہاں سے اپنے وطن ہنگری چلے گئے جہاں وہ اس وقت مقیم ہیں

پروفیسر الحاج ڈاکٹر عبدالکریم جرمانوس کی ایک کتاب "ترکوں کی اسلامی خدمات" کے عنوان سے اردو میں بھی چھپ چکی ہے۔ ترکوں کے ہمسایہ ہونے کی وجہ سے پروفیسر موصوف کو ترکی زبان اور ترکی ادب پر خاص عبور حاصل ہے۔ اور پھر آپ "پیشہ ورانہ" قسم کے مستشرق بھی نہیں۔ جو کہ شرقی علوم کو دنیا دارانہ غرض سے پڑھتے، اور خاص مقاصد کے ماتحت ان کے متعلق تصنیفات کرتے ہیں۔ پروفیسر جرمانوس کو اسلام اور اسلامی علوم سے جس قدر گہرا شغف ہے، اس کا اندازہ تو اس بات سے ہو سکتا ہے کہ آپ نے نہ صرف انہیں پڑھا، اور ان میں درک پیدا کیا، بلکہ خود ان کو اپنی زندگی میں یہاں تک اپنایا کہ مسلمان ہو گئے۔ حج کیا۔ اور جرمانوس کے بجائے اپنے آپ کو الحاج عبدالکریم جرمانوس کہلوانا پسند فرمایا۔

اس مختصر سے رسالے میں پروفیسر جرمانوس نے "مسلمان اقوام کے زوال کے اسباب" کو

متعین کرنے کی کوشش کی۔ اس میں وہ کہاں تک کامیاب ہوئے اس کا فیصلہ تو قارئین ہی کر سکتے ہیں، لیکن اس سلسلے میں پروفیسر موصوف کی یہ رائے، جسے انہوں نے بار بار اس رسالے میں دہرایا ہے خاص طور سے پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ مسلمان قوموں کے اس زوال کی ذمہ داری دینِ اسلام پر ہرگز نہیں آتی۔ چنانچہ اس ضمن میں مسلمانوں کی موجودہ اخلاقی ابتری کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:۔

"لیکن ہمیں اس جگہ قطعی طور پر اس دعوے کی تردید کر دینی چاہیئے کہ مسلمانوں میں یہ اخلاقی ابتری اسلامی تعلیمات کی وجہ سے پیدا ہوئی، اسلام پاک دامنی اور دیانتداری کی جس پُر خلوص یقین کامل کے ساتھ تعلیم دیتا ہے، اور اس نے اخلاقیات کا جس قدر بلند معیار رکھا ہے اس کے بعد تو ہمیں مسلمانوں کی بہت سی تاریخی شخصیتوں کا جنت الفردوس میں داخل ہونا مشکوک نظر آتا ہے۔"

پروفیسر جرمانوس صاحب کو شکایت ہے، اور ان کی یہ شکایت بالکل بجا ہے کہ

"انسانوں کی ابلیسی فطرت نے آسمانی احکام کو اکثر اپنی ذاتی اغراض کا تابع بنایا ہے، اسی بنا پر اسلام کے بارے میں بھی یہ غلط تاثر پیدا ہو گیا کہ اس کا مذہبی نظام مسلمانوں کی اس اخلاقی زبوں حالی کا ذمہ دار ہے۔"

کیونکہ "جہاں تک اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کا تعلق ہے" موصوف کا کہنا یہ ہے کہ

"صحیح یہ ہے کہ مسلمان ملکوں کے اکثر حکمرانوں نے ان پر عمل نہیں کیا۔ اور جو مذہبی رجحان رکھنے والے مسلمان تھے، وہ حکمرانوں کی روحانی اور معاشی لوٹ کھسوٹ سے دل برداشتہ ہو کر دنیا ہی سے منہ موڑ بیٹھے۔"

اس کے ساتھ ساتھ جہاں تک یورپ اور اسلام کا تعلق ہے، مصنف کو اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ:۔

"اگر مسلمان علماء کے شاندار علمی کارنامے نہ ہوتے تو یورپ ابھی تک جہالت اور نکبت میں پڑا سڑا کرتا۔"

اور پھر اسی ضمن میں موصوف اس حقیقت کا بھی اضافہ کرتے ہیں۔

"اگر مسلمانوں کی فتوحات اسپین پر نہ رک جاتیں، اور ان کا دائرہ وسط یورپ تک وسیع ہو جاتا تو مشہور انگریز مورخ گبن کے الفاظ صحیح ثابت ہوتے اور آج برطانیہ کی ادبی زبان عربی ہوتی۔"

پروفیسر جرمانوس نے اپنے اس رسالے میں مسلمان قوموں کے زوال کے اسباب کی صرف نشان دہی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ زوال کی اس دلدل سے نکلنے کی راہ بھی بتائی ہے۔ اس سلسلے میں ان کی رائے یہ ہے :-

"آج اسلام کا مستقبل صرف اسی صورت میں محفوظ ہو سکتا ہے۔ اگر وہ اس کلچر کو اپنا لے، جو نشاۃ ثانیہ کے بعد یورپ میں پھلا پھولا اور جو مشتمل ہے نظم و نسق حکومت، سائنس، فلسفہ اور آرٹ پر۔"

لیکن اس ضمن میں مصنف نے یورپ کی اندھا دھند تقلید کرنے کی بہت سخت الفاظ میں مذمت کی ہے اور لکھا ہے کہ "مسلمانوں کے ذی اثر اور ترقی یافتہ طبقوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی قوم کو سہولت پسند تمدن کے مضرت رساں اثرات اور دل لبھانے والے نعروں سے بچائیں اور انسانیت کے مناسب، مفید اور اخلاق کو بلند کرنے والے اصولوں پر، جو تمام دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ ایک سے رہے ہیں، خود عمل کر کے دوسروں کے لئے نمونہ بنیں، اور اس طرح وہ اپنی قوم کو ان اصولوں کی تلقین کریں۔"

پروفیسر موصوف نے اپنے مسلمان بھائیوں سے اپیل کی ہے کہ :-

"یورپ کے اس کلچر کو اپنانے کا یہ عمل بتدریج ہونا چاہئے اور اس میں
مشرق کے خصوصی حالات کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہئے۔"
کیونکہ بقول ان کے "اندھا دھند نقالی سے ایک صحت مند اور صحیح الامتزاج متوازن کلچر کبھی وجود میں نہیں آسکتا: اس لئے خود ان کے الفاظ ہیں :۔

"مشرق کو خود اپنے افکار و خیالات پر اعتماد کرنا چاہئے اور اسلام کو امیر اور
غریب دونوں کے لئے مشعلِ ہدایت رہنا چاہئے۔ نیز وہ کارنامے
جن پر کہ اسلامی کلچر بجا طور پر فخر کرسکتا ہے مستقبل کی تعمیر و ترقی میں ان کا
ادب و احترام برابر ملحوظ رہنا چاہئے۔"

اور آخر میں اس ضمن میں مصنف کا خاص طور سے یہ کہنا قابلِ توجہ ہے کہ :۔

"اسلام کا یہ تصور کہ خداوند تعالیٰ نے سب انسانوں کو برابر اور آزاد پیدا کیا ہے
ایک مضبوط ترین بنیاد ہے اجتماعی ذمہ داری کے احساس کی، اور اس
پر یقیناً ایک عظیم قوم کی عمارت اٹھائی جاسکتی ہے۔"

ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ مصنف کا یہ خیال ہے اور مترجم کو ان کے اس خیال سے بہت حد تک اتفاق ہے کہ مسلمان اہلِ قلم اور ارباب علم نے مسلمان قوموں کے زوال کا سراغ لگانے میں اکثر ٹھوکریں کھائی ہیں، وہ اس سلسلے میں بالعموم ایسی چیزوں پر زور دیتے ہیں جن کی قوموں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں زیادہ اہمیت نہیں ہوتی اور اکثر ایسی باتیں نظر انداز کر جاتے ہیں جو اصل قوموں کو بناتی اور بگاڑتی ہیں، چنانچہ عام مسلمان مفکرین اور مصنفین کا اس مرض کی صحیح تشخیص نہ کرنے کا ہی نتیجہ ہے کہ مسلمان اقوام کے عروج اور ان کے زوال کے اسباب کا صحیح معنوں میں اب تک سائنٹفک جائزہ نہیں لیا جاسکا۔ اور اس معاملے میں

کافی انتشارِ فکری پایا جاتا ہے اور چونکہ زوال کے اسباب کا صحیح طرح تعین نہیں ہو سکا اس لئے اس کا قدرتی نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کو اس زوال سے نکلنے اور شاہراہِ ترقی پر گامزن ہونے کا سیدھا راستہ نہیں مل رہا اور وہ اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں

پروفیسر جرمانوس اس صورتِ حال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :۔

"۔۔۔۔ ان نئے نئے بیدار ہونے والے مسلمانوں کی کتابوں میں، خواہ وہ ہندوستانی ہوں یا ترک یا عرب، 'مشرقی رومانیت' کی بڑی فراوانی ہے،۔۔۔۔ لیکن یہ مسلمان اہلِ قلم مسلمان اقوام کے حقیقی اسبابِ زوال پر روشنی نہیں ڈالتے، کیونکہ وہ خود ان حقائق سے کئی صدیاں ہوئیں منقطع ہو چکے ہیں۔"

اور زوال کے اصل اسباب تک یہ نارسائی صرف ان اہلِ قلم تک محدود نہیں جو یورپی زندگی اور یورپی علوم و فنون سے نابلد تھے۔ کیونکہ ان کو تو اس معاملے میں معذور بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن بقول مصنف کے :۔

"سید امیر علی سے لے کر سید جمال الدین افغانی تک سب کے سب یورپ کی مادی ترقی کو ہی مشرق پر اس کے غلبے کا سبب قرار دیتے ہیں، اور صرف اسی وجہ سے ان کے نزدیک یورپ اسلامی دنیا کو معاشی اور سیاسی دونوں اعتبار سے لوٹ کھسوٹ رہا ہے۔"

لیکن موصوف کے الفاظ میں :۔

"اس بات سے زیادہ سچائی سے اور کوئی چیز دور نہیں ہو گی۔"

ورنہ اس لئے گو یہ اہلِ قلم یورپ کے ظاہری رخ کو تو دیکھ سکے، لیکن یہ ظاہری رُخ جن معنوی اور روحانی حالات کا پرتو ہے، اُن تک ان کی نظریں نہیں پہنچ سکیں چنانچہ وہ غلطی سے

نتیجے کو سبب سمجھے، اور سبب کو جاننے پہچاننے کی انہوں نے ضرورت محسوس نہ کی۔

پروفیسر جرمانوس نے اس کتابچے میں جہاں مسلمان اقوام کے زوال کے اسباب کا سائینٹفک تجزیہ کیا ہے، وہاں یورپ کی سربلندی، اور غلبے کے جو حقیقی اسباب ہیں، ان کو بھی اجمالاً بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ دراصل نشاۃ ثانیہ کے بعد یورپ کی روح بیدار ہوئی اور اسی نے پھر نئے علوم و فنون، نئے افکار و خیالات اور نئے سیاسی و معاشی اداروں کو جنم دیا، چنانچہ:-

"یورپ کی تمام زبانوں میں سینکڑوں لافانی ادبی شاہکاروں کی تخلیق عمل میں آئی شیکسپیر۔ ریسائن۔ گوئٹے۔ اور اٹلی کے رزمیہ شاعر اور ڈرامہ نگار نے نئے نئے اسلوب اور زندہ جاوید ادبی خزینوں کو وجود بخشا۔ ادب اور فنون کے ان ناقابلِ مسابقت کارناموں کے علاوہ عقلی اور طبعی علوم بھی ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتے رہے۔"

یہ تھا بقول مصنف کے "یورپ کا معنوی احیاء" اسی "معنوی احیاء" ہی نے یورپ کو مادی لحاظ سے بعد میں اس قدر سربلندی بخشی، پروفیسر جرمانوس کے الفاظ میں:-

"یورپ کا یہ معنوی احیاء ان ٹیکنیکل ایجادات کے مقابلے میں، جنہوں نے ایک یورپی انسان کو مادی دنیا کا حاکم اور فرمانروا بنا دیا ہے، بے حقیقت نظر آتا ہے۔"

اور ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے اکثر مفکروں اور اہل قلم نے یورپ کے اس معنوی احیاء کو سرے سے درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا، اور وہ یورپ کی مادی ترقی کے مقابلے میں اپنی روحانی ترقی کا ذکر کرکے ترازو کا پلڑا برابر رکھنے میں کوشاں رہے: ان میں سے اکثر کا اب تک یہ اصرار ہے کہ بے شک مادی لحاظ سے یورپ ہم سے آگے ہے، لیکن جہاں تک کلچر

اور معنوی زندگی کا تعلق ہے، ہم اب بھی یورپ سے بہت آگے ہیں۔ پروفیسر جرمانوس نے مختصراً اس خام خیالی اور خوش فہمی کو بھی حتی الوسع دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

عروج و زوال کا پس منظر

اب تک جو کچھ لکھا گیا وہ تو ایک تعارف تھا مصنف کے بنیادی خیالات کا، جن کی وضاحت موصوف نے اس کتاب میں کی ہے۔ مصنف کے پیش نظر مسلمانوں کی تاریخ کے ایک دور کو جس کا تعلق خاص طور سے ان کے موجودہ زوال سے ہے، بیان کرنا تھا۔ چنانچہ موصوف نے اسے مختصراً اور اجمالاً بیان کر دیا، لیکن اگر مسلمانوں کی تاریخ کے اس دور کی مزید وضاحت کے لئے یہاں اس کا کچھ تاریخی پس منظر بھی پیش کر دیا جائے تو فائدے سے خالی نہیں ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمان اہل قلم نے مسلمان اقوام کے زوال کے اسباب کو سمجھنے میں جس طرح حقیقت پسندی سے زیادہ رعایت سے کام لیا ہے، اسی طرح ان کے عروج کو بھی انہوں نے صحیح نقطۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی اور اس کے اسباب اور ان کے نتائج کی نظری کسوٹی پہ پرکھنے کے بجائے اسے عموماً بے عنان تخیل کی بلند پروازیوں کے سپرد کر دیا۔

مسلمانوں کے عروج و زوال کے سلسلے میں یہ تاریخی حقیقت ذہن نشین رہے کہ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ۶۳۲ء میں ہوا اور آپ کے انتقال پر پورے سو سال بھی نہیں گذرے تھے کہ ادھر مشرق میں سندھ سے لے کر ادھر مغرب میں فرانس کی حدود تک کے یہ سارے ممالک آپ کے نام لیواؤں کے زیر نگیں آگئے۔ اس عالمی سلطنت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں نے ایک عالمی کلچر اور تہذیب کو بھی جنم دیا۔ جسے پروان چڑھانے میں، اس وقت کی معلوم دنیا کی سب قوموں اور سب تہذیبوں نے کم و بیش حصہ لیا، اس عالمی کلچر کا مرکز بغداد تھا جس

کے سرچشمے سے وقتاً فوقتاً کلچر کی سوتیں پھوٹیں اور صدیوں تک دنیائے اسلام کے دور دراز حصوں کو سیراب کرتی رہیں

بغداد کا سنگِ بنیاد تقریباً ۷۶۲ء میں رکھا گیا۔ اور اس کے فوراً بعد ہی اسے مسلمانوں کے اس عالمی کلچر کی مرکزیت حاصل ہو گئی۔ ۱۲۵۸ء میں تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد بالکل تباہ ہو گیا۔ اور عالمی کلچر کی وہ شمع جو وہاں تقریباً ۵۰۰ سال تک کبھی بڑی تابانی سے اور کبھی دھیمی روشن رہی ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔ لیکن اس شمع سے جو شعاعیں پھوٹ کر دوسرے اسلامی ملکوں میں پہنچ چکی تھیں وہ اس کے بعد بھی ایک حد تک روشن رہیں۔ چنانچہ آٹھویں صدی سے کر سولھویں صدی کے آخر تک پورے آٹھ سو سال مسلمانوں کی یہ عالمی تہذیب بلاخوف تردید دنیا کی باقی تہذیبوں سے آگے رہی۔ اور دوسری قومیں اسی سے خوشہ چینی کرتی رہیں۔

اس تمام عرصے میں مسلمان قومیں تجارت، صنعت، علم و ادب، معاشرت، قواعد جنگ اور فنون لطیفہ میں دنیا کی باقی قوموں سے پیش پیش تھیں۔ یہاں تک کہ جب سولھویں صدی کے شروع میں پرتگالی جہاز ران پہلی دفعہ افریقہ کے گرد گھوم کر جنوبی ہندوستان کے ساحلوں پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ انڈونیشیا، ملایا، بحر ہند اور بحیرۂ عرب کی ساری تجارت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ انہی کے جہاز ان سمندروں میں آتے جاتے ہیں۔ انہی کی تجارتی کوٹھیاں ان سمندروں کے ساحلوں پر موجود ہیں مسلمان ہی بڑے بڑے تاجر ہیں، اور انہیں کے اپنے جہازوں کے بیڑے ہیں۔ اور وہی ان کے امیر البحر ہیں۔ چنانچہ پرتگالی بیڑوں کی بحر ہند میں جو بھی لڑائیاں ہوئیں مسلمانوں کے بیڑوں سے ہوئیں۔ الغرض اس وقت تک مشرق اور مغرب کی تجارت کلیتہً مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی۔ اور وہ سنگاپور کی آبنائے سے گزر کر چین تک تجارتی جہاز لاتے اور لے جاتے تھے۔ اور پورا بحر ہند عملاً مسلمانوں کا

سمندر تھا۔

اسی سولھویں صدی کی ابتدا میں جب پرتگالی، ان کے بعد ولندیزی، اور پھر فرانسیسی اور انگریز جہاز راں جنوب مشرقی ایشیا کے سمندروں میں پہنچتے ہیں۔ تو برّ عظیم ہند اور مشرق قریب میں مغل اور ترکوں کی سلطنتیں طاقت پکڑتی ہیں۔ ترکوں کے سلطان سلیمان قانونی کے متعلق مشہور تھا۔ کہ وہ سات سمندروں اور سات برّ اعظموں پر حکومت کرتا ہے۔ اور ادھر ہندوستان میں اکبر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے زمانے میں اسلامی سلطنت شان و شوکت اور وسعت میں کہیں کہیں پہنچ گئی۔ اورنگ زیب کا ۱۷۰۷ء میں انتقال ہوتا ہے اور اس کو پچاس سال بھی نہیں گزرتے کہ مغل سلطنت کو پوری طرح گھن لگ جاتا ہے۔ اسی زمانے میں ترکی سلطنت کا بھی زوال شروع ہو گیا۔ چنانچہ وہ سلطنت جو کبھی افریقہ، ایشیا اور یورپ تینوں براعظموں کے ایک کافی بڑے حصے پر حاوی تھی اب بتدریج سمٹنے لگی اور روز بروز کمزور ہوتی جاتی ہے۔

اب ہوتا یہ ہے کہ ایک طرف مغلوں اور ترکوں کی سلطنتیں روبہ زوال ہوتی ہیں اور ان کے قدم روز بروز پیچھے کو ہٹتے ہیں اور دوسری طرف یورپی قومیں، ہندوستان تک پہنچنے کا نیا سمندری راستہ دریافت کر لیتی ہیں۔ جس کی وجہ سے مشرق کی ساری تجارت ان کے ہاتھ آ جاتی ہے اور سارے سمندروں پر ان کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اور بہ قول پروفیسر جرمانوس کے الفاظ میں

"یورپ نے اس وقت تک خود اپنی سرزمین میں اسلام کے حملوں کو سامنے سے روکا تھا، لیکن اب یورپی امن چلے خود اسلامی دنیا پر دائیں بائیں سے اور پیچھے سے حملہ کرتے ہیں۔"

چنانچہ جوں جوں وقت گزرتا گیا۔ یورپی قوموں کے ان حملوں کی شدت اور وسعت بڑھتی گئی اور مسلمان قوموں کی حالت اسی نسبت سے کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ جب ۱۹۱۴ء

کی پہلی جنگ عظیم ختم ہوتی ہے تو روئے زمین پر کوئی بھی ایسا اسلامی علاقہ نہ رہا تھا جس پر کسی نہ کسی یورپی طاقت کا بالواسطہ یا براہ راست قبضہ نہ ہو چکا ہو۔ اسلامی دنیا کے زوال کا شاید یہ آخری نقطہ تھا مختصراً یورپ اور اسلام کی جنگ جس کی ابتدا رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی میں شروع ہو گئی تھی۔ تیرہ سو سال کی مسلسل کش مکش کے بعد بالآخر ۱۹۱۸ء میں یورپ کی مکمل فتح پر منتج ہوئی۔

بے شک سترھویں صدی کے وسط تک یورپ اور اسلامی دنیا کا معاملہ تقریباً برابر برابر تھا۔ لیکن بقول پروفیسر جرمانوس کے سترھویں صدی کے آخر میں اسلام کی فوجی طاقت کو پہلی دفعہ دھکا لگتا ہے، اور اٹھارھویں صدی میں یورپ کی فوجی سائنس مسلمان اقوام کے فن جنگ پر کلی طور سے سبقت لے جاتی ہے، اسی زمانے میں موصوف کے الفاظ میں :-

> "اسلام اپنی تہذیبی توانائی کھو کر سیاسی لحاظ سے بھی پارہ پارہ ہو گیا اور اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ کیونکہ ہر سیاسی طاقت کی اساس اخلاقی و معنوی تہذیب ہوتا ہے اور جب کسی قوم کی اخلاقی اور معنوی تہذیب کو زوال آجائے تو اس کی سیاسی طاقت کا روبہ زوال ہونا یقینی ہو جاتا ہے۔"

غرضیکہ مسلمان قوموں کا سیاسی اور تہذیبی عروج جو آٹھویں صدی میں شروع ہوا وہ اور سولہویں صدی کے آخر تک کم و بیش قائم رہا۔ اور اس سارے طویل عرصے میں دنیا کی کوئی قوم ان سے آگے نہ بڑھ سکی، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ ایک تاریخی حقیقت ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس عروج کی نوعیت اور اس کے اسباب کے متعلق مسلمان اہل علم کی رائیں ہمیشہ سے عجیب غریب رہی ہیں۔ بعض حضرات رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے یوم وفات سے ہی مسلمانوں کے زوال کا آغاز کرتے ہیں بعض خلافت راشدہ کے اختتام سے اس زوال کی ابتدا

مانتے ہیں[1]۔ اور بعض ان کے نزدیک اسلام اور عرب مترادف ہیں، وہ عربوں کے سیاسی زوال سے اسلام کا زوال شروع کرتے ہیں۔

اس کے بعد اسلام کی جس عالمی تہذیب اور کلچر کا اوپر ذکر ہوا ہے، اس کو ہمارے اکثر علمائے دین اور اہل قلم اس تہذیب اور کلچر کو اسلام کا زیور نہیں، بلکہ اس کے لئے گھن سمجھتے ہیں۔ ان میں سے بہتوں کے نزدیک المامون جس نے فلسفہ و حکمت کو ترویج دی مردود اور المتوکل جس نے ارباب فلسفہ و حکمت کو بُری طرح کچلا قابلِ تعریف ہے۔ ہمارے دینی علماء کی نظر میں علم وہی قابلِ قبول ہے جس کا تعلق صرف دین سے ہو، اور وہ بھی ان کے اپنے مسلک کے مطابق؛ باقی رہے دوسرے علوم و فنون، تو ان کے نزدیک ان پر فخر کرنا اور انہیں اسلام کی تہذیبی فتوحات کے طور پر پیش کرنا کوئی قابلِ فخر بات نہیں۔ یہ نہ بغداد کی تہذیبی عظمت کو مانتے ہیں اور نہ مسلمانوں کے تعمیری شاہکاروں کو۔ ان کی نظر میں المامون کا یہ کارنامہ کہ اس نے یونانی فلسفے کو عربی زبان میں منتقل کرایا، دین اسلام پر ایک کاری ضرب تھی۔

اسلامی تاریخ کے مختلف ادوار، اسلامی تہذیب اور کلچر اور اسلامی تاریخ کی مشہور شخصیات کے متعلق ہمارے اکثر اہل علم اور مصنفین کے یہ غلط تصورات ہیں۔ جن کی وجہ سے ہمارے ہاں نہ مسلمانوں کے عروج کا صحیح یقین ہو سکا اور نہ ان کے زوال کو ٹھیک طرح سمجھا گیا۔ اس زوال کے اسباب کا کھوج لگانا تو الگ رہا، جو ظاہر ہے خاصہ مشکل کام ہے۔

---

[1] جب تک مسلمان اسلام کے فطری قوانین پر عمل پیرا رہے، وہ برابر ترقی کرتے رہے، لیکن جب ان میں اسلامی روح مضمحل ہونے لگی تو ان میں تنزل بھی پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ ہمارے انحطاط و تنزل کی داستان خلافت راشدہ کے اختتام کے بعد سے ہی شروع ہو جاتی ہے۔ (مولانا احمد سعید اکبر آبادی۔ ایم اے)

عروج کے اسباب

اسلام نے بحیثیت ایک دینی عقیدے کے گم کردہ راہ انسانیت کو جو کچھ دیا، یہاں اس کا ذکر مقصود نہیں، لیکن جن قوموں نے اسلام کو قبول کیا، اور اُسے اپنایا، ان کی کوششوں سے جو کلچر پیدا ہوا، اور ان کی وجہ سے جس نظامِ حکومت نے جنم لیا، واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں اُس زمانے کی سب سے بڑھکر ترقی خواہ اور انسانیت دوست قوتیں تھیں۔ جنہوں نے ایک طرف اُس دور کی سیاسی الجھنوں کو مٹایا۔ اور دوسری طرف تہذیبی تنگنایوں کو ختم کیا۔ اور ہر قوم اور ملک کی اچھی اور مفید چیزیں لے کر ایک عالمی تہذیب اور ایک عالمی سلطنت کی بنیاد رکھی جو انسانیت کے پس ماندہ کارواں کو بہت دور آگے لے جانے میں کامیاب ہوئی۔

ایک عرب اہل رائے کے الفاظ میں آج سے تیرہ سو سال پہلے جب عرب، جزیرہ عرب سے نکلے تھے تو ان کے پاس صرف دو چیزیں تھیں، ایک قرآن اور دوسری عربی زبان۔ انھوں نے روم و ایران میں جو بھی اپنے لئے مناسب اور مفید چیز پائی، اسے لے لیا، اور ان سب کو اپنی کٹھالی میں پگھلا کر ان سے ایک نئی تہذیب کا سانچہ بنایا۔ "علم حاصل کرو خواہ اس کے لئے تمہیں چین تک جانا پڑے"۔ یہ روح تھی اس تہذیب کی، جسے ۷ ساتویں صدی میں عربوں کی فتوحات نے وجود بخشا تھا۔ بقول پروفیسر جرمانوس کے :-

> "عربوں کی یہ تہذیب انتخابی یعنی "خذ ما صفا و دع ما کدر" کے اصول پر مبنی تھی، انھوں نے ہر اس چیز کو منتخب کیا اور اپنایا، جو قرون وسطیٰ میں ایک حد تک حریت پسندانہ رجحان کی حامل تھی۔"

شاید قارئین کو یہ سن کر تعجب ہو کہ حضرت خالدؓ بن ولید کو سیف اللہ بنانے میں

سب سے بڑی چیز جو مدد ہوئی تھی وہ ان کا جنگ موتہ میں رومیوں کا طریقہ جنگ دیکھنا اور بعد میں اسے اپنانا تھا یعنی بہادری اور مہارت جنگی تو ان کی اپنی تھی، لیکن طریقہ جنگ انہوں نے رومیوں جیسی ترقی یافتہ قوم سے سیکھ لیا۔ اسی طرح ۵ھ میں جب قریش نے ایک جم غفیر کے ساتھ مدینہ پر حملہ کیا تو رسول اللہ صلعم نے ایرانیوں کے طریقہ جنگ کو اختیار کر کے یعنی خندق کھود کر ہی ان کے شر سے اپنے آپ کو بچایا تھا۔

"حکمت اور دانائی مسلمانوں کی کھوئی ہوئی چیز ہے۔ جہاں بھی وہ ملے اُسے لے لو"

اس ارشادِ نبوی پر خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سب سے بڑھ کر عمل کیا۔ مولانا شبلی "الفاروق" میں لکھتے ہیں:۔

"حضرت عمر کی سیاست کا ایک بڑا اصول یہ تھا کہ وہ قدیم سلطنتوں اور حکمرانوں کے قواعد اور انتظامات سے واقفیت پیدا کرتے تھے۔ اور ان میں جو چیزیں پسند کے قابل ہوتی تھیں، ان کو اختیار کرتے تھے۔ خراج، عشور، دفتر، رسید کا قدامِ حساب ان تمام انتظامات میں انہوں نے ایران اور شام کے قواعد پر عمل کیا، البتہ جہاں کوئی نقص پایا اس کی اصلاح کر دی۔"

الفاروق ہی میں علامہ ابن مسکویہ کی یہ عبارت مذکور ہے :۔ "حضرت عمرؓ فارس کے چند آدمیوں کو صحبتِ خاص میں رکھتے تھے۔ یہ لوگ ان کو بادشاہوں کے آئین حکومت پڑھ کر سنایا کرتے تھے، خصوصاً شاہان عجم، اور ان میں بھی خاص کر نوشیرواں کے۔ اس لئے کہ ان کو نوشیرواں کے آئین بہت پسند تھے اور وہ ان کی بہت پیروی کرتے تھے۔"

مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ "عموماً مورخوں نے لکھا ہے کہ جب فارس کا رئیس ہرمزان اسلام لایا، تو حضرت عمرؓ نے اس کو اپنے خاص درباریوں میں داخل کیا۔ اور انتظامات ملکیہ متعلق

اُن سے اکثر مشورے لیتے رہتے۔"

چنانچہ حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں نظم و نسقِ حکومت کے بہت سے قاعدے ایرانیوں سے اخذ کیے، اور تو اور بقول مولانا شبلی کے۔

"جزیہ حالانکہ بظاہر مذہبی لگاؤ رکھتا تھا، تاہم اس کی تشخیص میں وہی اصول ملحوظ رکھے جو نوشیرواں نے اپنی حکومت میں قائم کیے تھے"۔

دوسری قوموں سے مفید اور ضروری چیزوں کے اخذ و قبول کا یہ عمل خلافتِ راشدہ کے بعد عہدِ اموی میں بھی جاری رہا، اور اس معاملے میں مسلمان کبھی اس زمانے میں Inferiority complex (احساسِ کمتری) کا شکار نہیں ہوئے۔ عباسی دور میں اس اخذ و قبول کی رفتار اور بھی تیز ہو گئی۔ اور المامون کے عہد میں دنیا جہان کے علوم و فنون کے عربی زبان میں ترجمے ہو گئے۔ اور بغداد صحیح معنوں میں اس زمانے کا بین الاقوامی علمی اور تہذیبی مرکز بن گیا۔

المامون کے انتقال ۸۳۳ھ کے کچھ عرصہ بعد بغداد کو گو پہلے کی سی سیاسی مرکزیت حاصل نہ رہی، لیکن اس سیاسی مرکزیت سے یہ ایک فائدہ ضرور ہوا کہ جہاں بھی نئی نئی آزاد اور نیم آزاد اسلامی حکومتیں قائم ہوئیں۔ اُن کے پایۂ تخت اسلامی علم و ادب، اور تہذیب و تمدن کے مرکز بن گئے۔ اس دور میں قرطبہ، قاہرہ، بخارا، غزنی اور بعد میں لاہور اور دہلی اسلامی تہذیب کے مرکز کی حیثیت سے وجود میں آتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اگر یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا۔ تو باوجود اپنے نشیب و فراز نیز سیاسی انقلابات کے جو اس دوران میں ہوتے رہے، اسلامی تہذیب کا ارتقا برابر جاری رہتا اور وہ آگے بڑھتی جاتی، اس کا اخذ و قبول کا دور جو ہر نئی تہذیب کے لیے ضروری ہوتا ہے، تقریباً ختم ہو چکا تھا مسلمانوں میں یونانی

فلسفے کی مرعوبیت اب کم ہو رہی تھی، اور تشکک و تنقید کا رجحان جو ہر فکری اور علمی تحقیق کا لازمہ ہے مسلمان اہل علم میں پیدا ہو چکا تھا، جس کی ایک مثال امام غزالی ہیں۔ اگر حالات یہی رہتے اور شمال میں صلیبی حملے اور جنوب مشرق میں تاتاری سیلاب اس تہذیب کے سب سے بڑے مرکزوں کو تباہ نہ کرتے تو پروفیسر جبانوس کی یہ پیشن گوئی بالکل صحیح ثابت ہوتی کہ:-

"اگر سیاسی حالات مسلمانوں کی علمی سرگرمیوں کو مفلوج نہ کر دیتے تو یہ اصول کہ میں ہوں کیونکہ میں سوچتا ہوں[1] مسلمان دماغوں ہی کے ذریعہ یورپ میں داخل ہوتا"

ایشیائے کوچک، شام و فلسطین اور مصر پر صلیبی حملوں کا آغاز ۱۰۹۶ء میں ہوا اور تقریباً دو سو سال تک عیسائیوں کے یہ حملے ان علاقوں کو تباہ و برباد کرتے رہے۔ ان حملوں کی وجہ سے نہ صرف یہ علاقے جو اس زمانے میں بڑے شاداب و آباد تھے۔ ویران ہو گئے اور ان کے لکھوکھا باشندے تہ تیغ ہوئے، بلکہ ان علاقوں میں جو ہزارہا کتب خانے تھے۔ وہ بھی جلا دیئے گئے۔ اور اس طرح گزشتہ چار پانچ سو سال میں ان اطراف میں علم و ادب نے جو ترقی کی تھی۔ وہ سب ان خونخوار صلیبیوں کی نذر ہو گئی۔

ان صلیبیوں کے سیلاب کو روکنے کے لئے اس زمانے میں بڑی تعداد میں جنگجو سپاہیوں کی ضرورت پڑی، جسے وسط ایشیا سے ترکمانوں کو بھرتی کر کے پورا کیا گیا۔ بے شک یہ ترکمان بڑے بہادر تھے لیکن تھے۔ فوجی اجڈ اور نئے نئے مسلمان۔ انہوں نے صلیبیوں کے حملوں کی روک تھام کر دی اور بعد میں جب تاتاری بغداد کو تباہ کر کے مصر کی طرف بڑھے، تو ان کو بھی شکست فاش دی اور قاہرہ کا حشر بغداد کا سا نہ ہونے دیا۔ لیکن یہ خود بھی اچھے حکمران ثابت نہ

---

[1] یہ اصول ڈیکارٹ نے وضع کیا، جو یورپی فلسفہ کا امام سمجھا جاتا ہے (مترجم)

ہوئے اور ان کی حکومت خالص فوجی قسم کی حکومت بن کر رہ گئی جس کی وجہ سے اسلامی تہذیب ان علاقوں میں جان بر نہ ہو سکی۔ چنانچہ پروفیسر جرمانوس کے الفاظ ہیں :

"مصر کی اس طویل عرصے کی تاریخ ممالیک حکمرانوں کے آئے دن کے جھگڑوں سے بھری ہوئی ہے اور یہی چیز آپ کو شام و عراق میں بھی ملے گی۔"

الغرض صلیبیوں کے دو سو سال کے متواتر حملوں نے ایشیائے کوچک، مصر و شام و فلسطین کو ذہنی، علمی، تہذیبی اور ساتھ ساتھ معاشرتی اور سیاسی لحاظ سے اس بُری حالت کو پہنچا دیا لیکن اس کے فوراً بعد تاتاریوں کے ہاتھوں وسط ایشیا، ایران، عراق اور شام وغیرہ پہ جو گزری، اس کی تو تاریخ میں مثال نہیں مل سکتی۔ ۱۲۱۸ء میں چنگیز خان تاتاری نے وسط ایشیا کے اسلامی ممالک کا رُخ کیا۔ اس زمانے میں یہ علاقے کافی آباد اور ترقی یافتہ تھے۔ چنانچہ ہرات اور بلخ کی آبادی دس دس لاکھ کے قریب تھی اور بخارا اور سمرقند میں تو اس سے بھی زیادہ لوگ آباد تھے۔ ان شہروں کو جلاتا اور ان کے باشندوں کو قتل کرتا چنگیز خاں آگے بڑھا، اور جو شہر بھی راستے میں آیا، اُسے تباہ و برباد کرتا گیا۔ ایک مؤرخ کی روایت کے مطابق صرف ایک شہر نیشاپور اور اس کے اردگرد کے اضلاع میں کوئی سترہ لاکھ آدمی مارے گئے۔

چنگیز خاں کے اس حملے میں جتنا انسانی خون بہا۔ اور تہذیب، تمدن اور علم و حکمت کی جس قدر بربادی ہوئی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ چنانچہ اس عذابِ الٰہی کے بعد اب تک یہ علاقے پہلے کی طرح آباد نہیں ہو سکے اور چنگیز خاں نے اگر کوئی کسر چھوڑی تھی تو وہ اس کے جانشین ہلاکو خاں نے ۱۲۵۸ء میں بغداد کو تباہ و برباد کر کے پوری کر دی۔ ابن خلدون کے نزدیک بغداد کی آبادی اس وقت بیس لاکھ تھی، جس میں سے کہتے ہیں، چار لاکھ زندہ بچ سکے

اس کے علاوہ بغداد کی اس بربادی کے ساتھ تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کو جو نقصان پہنچا، اس کا تو اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ سید امیر علی کے الفاظ میں بغداد کے ساتھ۔

"پانچ صدیوں کی جمع شدہ علمی متاع ہمیشہ کے لئے نابود ہو گئی اور وہ طبقے جو قوم کا نچوڑ تھے مٹ گئے۔"

بغداد کے بعد یہ تاتاری سیلاب شام تک بڑھتا چلا گیا۔ چنانچہ حلب میں تاتاریوں کے ہاتھوں پچاس ہزار مسلمان مارے گئے اور ان کی دس ہزار عورتیں اور بچے غلام بنا کر بیچ دیے گئے۔ وہ تو ان کو منظور تھا کہ مصر ان کی تباہ کاریوں سے بچ جائے۔ ورنہ یہ غارت گر معلوم نہیں، مصر کا بیک شکست دے کر وہاں کیا نہ کچھ کرتے۔

مسلمان اقوام کی موجودہ ذہنی معاشرتی اور تہذیبی پستی، نیز ان کی سیاسی بدنظمی اور معاشی بدحالی کو صحیح طرح سمجھنے کے لئے، یہ تاریخی حالات و واقعات، بطور پس منظر کے ضرور پیش نظر رہنے چاہئیں، جہاں تک مشرق قریب کے ملکوں یعنی مصر و شام و ایشیائے کوچک کا تعلق تھا دو سو سال کے صلیبی حملوں اور ان کے بعد ممالیک کی فوجی حکومتوں نے ایک طرف وہاں کی آبادی کو اپنے ماضی کے تمام تہذیبی اور علمی سرمائے سے محروم کر دیا۔ اور دوسری طرف اس کی وجہ سے ان ملکوں میں ایسے معاشی و اجتماعی حالات پیدا ہو گئے کہ ان کی موجودگی میں قوم کی فکری توانائیاں شل ہو کر رہ گئیں بعینہ یہی کچھ وسط ایشیا، ایران، عراق، افغانستان اور ہندوستان میں ہوا۔ گو ہندوستان چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کے عذاب سے بچ گیا۔ لیکن انہیں کے ایک نام لیوا تیمور کے ہاتھوں اس پر بھی کافی تباہی آئی، لیکن چونکہ تہذیب کی وہ شمع جو بغداد میں روشن ہوئی تھی اور جسے بخارا، ہرات اور سمرقند وغیرہ میں، ایک نئی زندگی ملی تھی، ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔

تھی۔ اس لئے گو اُس کی پہلی شعاعوں سے سیل تاتار کے بعد بھی دہلی اور قسطنطنیہ کی علمی مجلسیں قدرے روشن رہیں، لیکن جب وہ کتب خانے نہ رہے جن سے کسب علم ہوتا اور وہ لوگ نہ رہے جو کسب علم کرتے، اور وہ علمی دجماعتی ادارے مفقود ہوگئے، جن سے افراد تربیت پاتے تھے، اور روایات کا وہ تسلسل نہ رہا جس سے پہلوں کے علم کے بعد والے وارث بنتے تھے۔ تو تہذیب میں جان کہاں سے آتی، اور دماغوں میں نئی سوچ کیسے پیدا ہوتی۔

چنانچہ سید امیر علی اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:۔

"جب ابن سینا کا ستارہ افق پر ظاہر ہوا تو اُس زمانے کے حالات بڑے سازگار نظر آتے تھے۔ ابن سینا کے علم اجتماع اور اس سے متعلقہ دوسرے علوم کے اعلیٰ تصورات کو اپنانے کے لئے... لیکن عین اس وقت صلیبی حملوں نے مسلمانوں کی ساری توجہ موت و زندگی کی اس کش مکش میں اپنے آپ کو بچانے کی طرف مبذول کر دی۔ اور ابھی اس سے انہیں نجات ملی ہی تھی کہ تاتاری سیلاب نے اُن کو آلیا اور وہ اپنے ساتھ مشرق کا تمام تر کلچر اور تہذیب بہا کر لے گیا۔"

زوال کے اسباب اور اُس کا علاج

اتنے شاندار عروج کے بعد مسلمانوں کا اس قدر بھیانک زوال کیسے ہوا؟ اس کا مختصر سا پس منظر ابھی پیش کیا جا چکا ہے۔ زوال کی نوعیت، اور اس کے اسباب اصل کتاب میں مصنف نے قدرے تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ اس زوال کا علاج کس طرح

ہو سکتا ہے، اس کے متعلق مصنف کی رائے یہ ہے کہ اسلام کے بلند اصولوں کو برقرار اور اسلامی تہذیب کے قابلِ فخر کارناموں کا ادب و احترام ملحوظ رکھتے ہوئے مسلمان اس کلچر کو اپنائیں، جو یورپ میں نشاۃ ثانیہ کے بعد پھلا پھولا اور جو مشتمل ہے نظم و نسقِ حکومت، سائنس فلسفہ اور آرٹ پر۔

مترجم کے نزدیک مسلمانوں کے زوال کے مسئلے پر اتنی وضاحت اور صاف بیانی سے آج تک کم ہی لکھا گیا ہے، اور خاص طور سے مسلمان اہل قلم میں سے شاید ہی کوئی ہوگا، جس نے مسلمانوں کی موت و زندگی سے تعلق اتنے اہم سوال پر اس خلوص نیت اور ذہنی صفائی سے غور کیا ہو۔ عام طور پر ہمارے ہاں سائنٹیفک رجحان بہت کم اور رومانیت بہت زیادہ ہے۔ نیز ہم اجتماعی معاملات کو ان کے تاریخی پس منظر میں دیکھنے کے عادی نہیں رہے، چنانچہ جہاں ہم مسلمانوں کے عروج کو اس کے تاریخی پس منظر میں نہیں دیکھتے اسی طرح بالعموم ہم اپنے زوال کا سراغ لگانے کے لئے واقعات ما سبق پر نگاہ نہیں رکھتے، نتیجہ یہ ہے کہ ہم سرد و چیزوں میں شاعری کرتے ہیں، نظم میں نہ سہی نثر میں سہی۔

قصہ کوتاہ، اس سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ہوگا۔ کہ مسلمان اقوام بحیثیت مجموعی ابھی تک زوال کے زنغے میں پھنسی ہوئی ہیں، اور یہ زوال مادی بھی ہے، اور معنوی اور روحانی بھی، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ مادی سے کہیں زیادہ معنوی اور روحانی ہے، تو اس میں چنداں مبالغہ نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے کہ ہر مسلمان قوم اپنے اپنے خیال کے مطابق، جہاں تک کہ اس سے بن پڑتا ہے۔ اس زوال پر قابو پانے میں کوشاں ہے، اور اپنے اپنے حالات کے مطابق اصلاحِ احوال میں لگی ہوئی ہے۔

سب سے پہلے ہم ترکوں کو لیتے ہیں، انہوں نے ترک قوم کے زوال کا علاج ترکی

قومیت جس میں اسلام بحیثیت ایک مذہب کے پوری طرح موجود ہے جو یورپی کلچر کو اپنانے یعنی ترک اور مسلمان رہتے ہوئے یورپین بننے میں ڈھونڈتا ہے، اور نہ اس پر عمل پیرا ہیں۔ عربوں کے سامنے عرب قوم کو زوال سے نکلنے کا یہ نسخہ ہے کہ تمام عرب یعنی وہ سب قومیں جن کی زبان عربی ہے، اور جو گذشتہ تیرہ سو سال میں عربی تہذیب اور عربی تاریخ کو اپنا چکی ہیں، عربی قومیت کے جھنڈے تلے جمع ہوں، اس قومیت کی روح تو اسلام کا عقیدہ اس کی تہذیب اور اس کی روایات ہوں، لیکن اس کا خارجی جسم عربی ہو۔ یورپی کلچر کو اپنانے کا عمل عربوں کے ہاں اتنا تیز نہیں جتنا ترکی میں ہے اور کہیں کہیں تو اس یورپی کلچر کے خلاف ذہنی منافرت بھی موجود ہے۔

ایران بھی کم و بیش ایرانی قومیت اور یورپی کلچر کو اپنانے کی راہ پر اسی طرح گامزن ہے۔ گو وہاں کے مذہبی طبقے یورپی کلچر کو اپنانے کی سخت مخالفت کر رہے ہیں انڈونیشیا میں جسے ہالینڈ سے آزادی حاصل کئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا، انڈونیشی قومیت ہی کے اساس پر اپنے مستقبل کی عمارت کو تعمیر کرنے کا رجحان رکھتا ہے۔ باقی رہا اس کا یورپی کلچر کو اپنانے کا معاملہ، تو ابھی وہاں ایسے مذہب پرست عناصر کا کافی زور ہے، جو اس میلان کے سخت خلاف ہیں۔ جہاں تک شمالی افریقہ کے مسلمان ملکوں کا تعلق ہے وہ ابھی فرانس سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد میں لگے ہوئے ہیں۔

ترکی ہو یا مصر، ایران ہو یا انڈونیشیا، ان تمام اسلامی ملکوں میں اگر ایک طرف یورپی کلچر کو اپنانے کا رجحان موجود ہے تو دوسری طرف اس کے بالکل برعکس یورپی کلچر کو کلیتہ مسترد اور اس سے انکار کرنے کا بھی میلان پایا جاتا ہے بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ اگر کبھی ان ملکوں میں یورپی کلچر کو اپنانے کے حامی حدِ اعتدال سے آگے بڑھ گئے۔ تو وہاں کے

عوام میں اس کے خلاف لازماً ایک شدید ردِ عمل ہوگا۔ جیسا کہ اخوان المسلمین کی شکل میں مصر اور بعض دوسرے عربی ممالک میں ہوا اور ترکی میں بھی مذہب پرست لوگوں کی ایک ایسی جماعت وجود میں آگئی جو اتا ترک کے مجسموں کو توڑنا کارِ ثواب سمجھنے لگی۔

واقعہ یہ ہے کہ عام مسلمانوں کو خواہ وہ کسی ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ اسلامی ملک کے کیوں نہ ہوں، اسلام، اس کی روایات اور اس کے تہذیبی اثاثے کے ایک حصے سے غلو کی حد تک جذباتی لگاؤ ہے۔ اور یورپی کلچر کو اپنانے کے حامی طبقے نے اگر اپنے جوشِ تجدد اور شوقِ تفریح میں اس کا خیال نہ رکھا اور اس معاملے میں عام مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی، تو اس کا نتیجہ اس طبقے اور اس کے مشن کے لئے بڑا خطرناک ہوگا۔ اس سلسلے میں پروفیسر جرمانوس نے جو نصیحت کی ہے وہ نہ صرف صحیح بلکہ عام مصلحت کے مطابق بھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"یورپ کے اس کلچر کو اپنانے کا یہ عمل بتدریج ہونا چاہیئے، اور اس میں مشرق کے خصوصی حالات کا خاص طور سے خیال رکھنا چاہیئے؛ جو کچھ کہ یورپ میں ہو چکا ہے، اس کی اندھا دھند نقالی، جس کو اختیار کرنے پر لازماً اعتراضات کی بھی بھرمار ہوگی، ایک صحت مند اور صحیح امتزاج متوازن کلچر کبھی پیدا نہیں کر سکے گی، بلکہ الٹا لوگوں کے جذبات کو ان کی اپنی روایات سے منحرف کر دے گی۔"

غرضیکہ یورپ کے کلچر کو اپنانے کا یہ کام بڑی سوجھ بوجھ اور دور بینی سے ہونا چاہیئے۔ اس میں افراط بھی اتنی ہی نقصان دہ ہوگی، جتنی کہ تفریط۔ اگر مسلمان قوموں نے اس کلچر کو نہ اپنایا تو وہ مثال کے طور پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یمن اور افغانستان کی طرح

پھر رہیں گی لیکن اگر وہ اپنانے کے اس عمل میں اپنے ماضی سے بالکل کٹ گئے۔ تو ڈر یہ ہے کہ وہ ہمارے ہاں کے اینگلو انڈین کی طرح کی تہذیب میں بے حسب و نسب ہو کر نہ رہ جائیں۔

برِ عظیم پاک ہند میں

اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال (۱۷۰۷ء) کے کچھ عرصہ بعد بر عظیم پاک و ہند کے ہر حصے میں بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ اور ساتھ ہی باہر سے حملے بھی ہونے لگے۔ ان اندرونی فتنوں اور بیرونی حملوں کی وجہ سے مغل سلطنت ڈگمگانے لگی، اور ہندوستان کے مسلمانوں کو صحیح معنوں میں اپنے زوال کا پہلی بار احساس ہوا۔

بے شک اس زوال کی تشخیص اور اس پر قابو پانے کی ہر شعبۂ زندگی میں کوششیں ہوئی ہوں گی لیکن یہاں اس وقت یہ موضوع زیر بحث نہیں، ہم اس ضمن میں صرف حضرت شاہ ولی اللہ (۱۷۱۱ء - ۱۷۶۲ء) کا ذکر کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے بحیثیت ایک عالم دین، مصنف، اور مفکر کے ہندوستانی مسلمانوں کے اس زوال سے بحث کی اور اس پر قابو پانے کے لئے ایک فکری تحریک کی داغ بیل ڈالی۔ بے شک اس سلسلے میں انہوں نے عملی کوششیں بھی کیں لیکن ان کا ذکر یہاں مقصود نہیں۔

ہمیشہ قوموں کی سیاسی اور اجتماعی وحدت ان کی فکری اور ذہنی وحدت کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اورنگ زیب عالم گیر کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کا ذہن انتشار کا شکار ہو چکا تھا، اور ان کے اندر فکری ہم آہنگی اور مذہباً ایک ہونے کا احساس نہیں رہا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے بحیثیت ایک مفکر کے سب سے پہلے اس کا تدارک کرنا چاہا۔ اکبر اعظم کے زمانے سے

مسلمان اہل فکر کے ہاں دو علمی نظریے، جو ایک دوسرے کے متضاد سمجھے جاتے تھے، بار پا گئے تھے۔ ایک وحدت الوجود کا نظریہ جس کا عملی نتیجہ عملی زندگی میں مذہبی رواداری اور صلح کل مشرب کی صورت میں نکلتا تھا اور دوسرا وحدت شہود کا نظریہ، جو مذہبی معاملات میں شدت اور علیحدگی پسندی کی طرف لے جاتا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے ان دونوں علمی نظریوں کو آپس میں اس طرح سمویا کہ ان کا تضاد رفع ہو گیا اور ایک مسلمان کا پابند اسلام رہتے ہوئے صلح کل اور مذہباً روادار ہونا ناممکن نہ رہا۔ دوسرا بڑا اختلاف مسلمانوں کے ہاں شیعہ سنی کا تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ ہندستان میں مسلمانوں کی حکومت کو ختم کرنے میں اس اختلاف کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ شاہ ولی اللہ نے تاریخ اسلام کے اس دور کی صحیح تعبیر کر کے اس کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد علماء اور صوفیاء یعنی اہل شریعت اور اہل تصوف کا نزاع جو مسلمانوں کے قلبی سکون کو ختم کر رہا تھا۔ ان کا محل توجہ بنا، اور ساتھ ساتھ حدیث اور فقہ اور چار اماموں کی فقہ کے آپس میں جو جھگڑے چلے آتے تھے۔ ان کا آپ نے حل ڈھونڈا، اور اس طرح اسلام کو ایک ایسی مرکب اور مربوط وحدت کی شکل میں پیش کیا کہ اسے مسلمانوں کا ہر مذہبی فرقہ اپنا اسلام مان سکتا تھا۔ اور اس کی بنیاد بھی قرن اول یعنی عہد رسالت اور خلافت راشدہ کے خالص اور بے میل اسلام پر تھی۔ کیونکہ یہی ایک اساس ہے جس پر سب فرقے جمع ہو سکتے تھے۔

اس کے علاوہ شاہ ولی اللہ نے مذہب کو انسانوں کے عمومی مفاد اور ان کی بھلائی اور بہتری میں برسر کار لانے پر بھی زور دیا، اور یہ بتایا کہ اصل مقصد مذہب کے شعائر یعنی اس کی ظاہری شکل نہیں بلکہ اس کی روح ہے۔ مذہب محض عقیدہ اور عبادات و رسوم کا نام نہیں، بلکہ اس کے اعلیٰ اصولوں کو اپنی ذاتی اور پورے معاشرے کی زندگی میں عملی جامہ

پہنانا بھی ہے۔ شاہ صاحب کے مذہب کا یہ تصور اخلاقی بھی تھا، فعال بھی اور اجتماعی بھی۔ نیز اس سے انسانیت دوستی، اور خدمتِ انسانیت کی طرف بھی رہنمائی ہوتی تھی

جس طرح یہ شکایت ہے کہ عربی دورِ حکومت کے آخر میں ابن خلدون جیسا اپنی طرز کا واحد صاحب تخلیق اجتماعی مفکر (وفات ۱۴۰۶ء) ہوا۔ لیکن بعد میں اس کے تاریخ و اجتماع میں تخلیقی افکار و نظریات کو اور آگے لے جانے اور انہیں مزید جلا دینے والا کوئی دوسرا پیدا نہ ہوا۔ یہی تاریخی سانحہ ایک حد تک شاہ ولی اللہ کو بھی پیش آیا ہے شک ان کے بعد ان کے صاحبزادوں اور دوسرے بزرگوں نے ان کی علمی تحریک کو جاری رکھا لیکن اس علمی تحریک کا جو فکری و تخلیقی پہلو تھا جس سے کہ ذہن کے سامنے نئے آفاق کھلتے ہیں، آنکھیں بجائے پیچھے کے آگے کو دیکھتی ہیں۔ اور دلوں کے عزائم اور ولولے گزری ہوئی باتوں کو پالینے کے بجائے نئی دنیائیں تخلیق کرتے ہیں، اس کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اور شاہ ولی اللہ کی اصلاحی تحریک کا سارا مقصد پیچھے کی طرف لوٹانا سمجھ گیا اور اس میں اتنا غلو بڑھ گیا کہ ان کی وہ تصنیفات جن میں شرعی علوم کے بجائے حکمت و معرفت اور اجتماعی نظریات سے بحث کی گئی ہے، انہیں بھلا دیا گیا۔

شاہ ولی اللہ کے پیشِ نظر اسلام کو اس کے اصل سرچشمے یعنی قرآنِ اوّل سے نئے سرے سے ہم کنار کر کے اس میں وہی معنوی توانائی اور وہی تخلیقی ذہن پیدا کرنا تھا جس نے کہ اُس زمانے میں دنیا کی تاریخ کا ایک نیا ورق الٹ دیا تھا، اور انسانیت کو ایک نئی تہذیب اور ایک نیا نظامِ زندگی دیا تھا۔ لیکن شاہ صاحب کے عالی مرتبہ متبعین نے قرنِ اوّل جیسے اسلامی نظام کو بجنسہٖ دوبارہ وجود میں لانا ہی اپنا مقصد بنا لیا۔ بالاکوٹ کا حادثہ (۱۸۳۱ء) جس میں حضرت سیّد احمد اور حضرت شاہ اسمٰعیل سکھوں سے لڑتے ہوئے

شہید ہوئے۔ اس کوشش کا جو نتیجہ ہے۔ وہ قابل احترام ہے۔ عبرت ناک انجام پیش کرتا ہے

انگریزوں کے تسلط ۱۸۵۷ء کے بعد ایک حد تک شاہ ولی اللہ ہی کے اصولوں پر مدرسۃ العلوم دیوبند اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی تعلیمی تحریکیں شروع ہوئیں۔ سر سید نے شاہ صاحب کی حکمت کو اپنے تجدیدی افکار کا اساس بنایا، چنانچہ ان کی تفسیر القرآن میں بہت کثرت سے شاہ ولی اللہ کے حوالے ملتے ہیں، اور دیوبند والوں نے شاہ صاحب کے فقہ و حدیث کے متعلق جو اصلاحی افکار تھے ان کی نشر و اشاعت کو اپنا مقصد بنایا۔ اس ضمن میں آخرالذکر گروہ کا زیادہ تر ربط عام مسلمانوں سے بڑھا اور علی گڑھ تحریک انگریزی پڑھے ہوئے اور انگریزی نوکریوں کے متلاشی حضرات تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اس دوئی کا جو نتیجہ نکلا وہ آپ کے سامنے ہے۔

اسی زمانے میں ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریکیں اٹھتی ہیں۔ اور کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاسی تنظیمیں وجود میں آتی ہیں۔ اور "ہندوستانی قومیت" کا چرچا ہوتا ہے۔ برعظیم کے مسلمانوں نے بحیثیت مجموعی اس "ہندوستانی قومیت" میں جو ان کے نزدیک "ہندو قومیت" کا دوسرا نام تھا ضم ہونا اور اس میں اپنے اسلامی وجود کو گم کرنا پسند نہ کیا۔ اور اس برعظیم کے ایک حصے پر اپنی ایک الگ آزاد اسلامی مملکت قائم کر لی۔

پاکستان کے قیام سے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک بہت بڑی ذہنی الجھن سے نجات مل گئی۔ بزمانہ جغرافیائی اور علاقائی قومیتوں کا ہے۔ متحدہ ہندوستان میں ان کو یہ دقت تھی کہ اگر وہ ہندوستانی قومیت اختیار کرتے تو ان کا اسلامی وجود ختم ہوتا تھا اور ان کو ہندوؤں میں جو غالب اکثریت میں تھے گم ہونا پڑتا تھا، لیکن پاکستان بننے کے بعد اب ان کے لئے ممکن ہو گیا۔ کہ وہ اپنے اسلام اور قومیت دونوں کو پاکستانی قومیت میں جمع دیکھ سکتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کا وہ عقیدہ بھی یا آپ اسے مذہبی جذبہ کہہ لیجئے، کافی حد تک کمزور ہو گیا ہے جو ان

کی توجہ اپنے ملک کے بجائے ہمیشہ دوسرے اسلامی ملکوں کی طرف مبذول رکھتا تھا۔ اور وہ اپنے قریب کے اور ہم وطن مسلمان ہمسائے کے مقابلے میں ترکی، مصر و عراق کی ہمدردی کی فکر میں زیادہ غلطاں رہتے تھے۔ بدقسمتی سے ایک عرصہ دراز سے ہندوستانی مسلمانوں کی نظریں اپنے سوا دوسرے اسلامی ملکوں کی طرف لگی ہوئی تھیں، اس سے جہاں ان کو اور نقصانات پہنچے وہاں ایک نقصان یہ ہوا کہ ان کے ہاں جغرافیائی اور علاقائی قومیت کا شعور ابھر نہ سکا، جو اِس زمانے کی سیاسی و معاشی تنظیم کے لئے لازمی ہے۔ بے شک اس کے کچھ خاص اسباب بھی تھے، جیسا کہ ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ بہرحال پاکستان بننے کے بعد یہ اسباب ختم ہو گئے ہیں چنانچہ اب اس کا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان مسلمان رہتے ہوئے جغرافیائی قومیت کو اپنا سکیں۔

برعظیم کے مسلمانوں کی جغرافیائی اور علاقائی قومیت کا مسئلہ تو یوں حل ہو گیا۔ اب سوال یورپ کے کلچر کو اپنانے کا رہ جاتا ہے، جہاں تک کہ اس کلچر کے انفرادی مظاہر، ظاہری طور طریقے، حکومت کے نظم و نسق، اور تجارت و صنعت و معاشرت کے قواعد و ضوابط کا تعلق ہے۔ انگریزوں کے سو سالہ دورِ حکومت کی وجہ سے یہ چیزیں ہمارے ہاں بہت حد تک داخل ہو چکی ہیں، اور پاکستان بننے کے بعد تو ان کو اخذ کرنے کا رجحان اور بھی بڑھ رہا ہے۔ نیز جوں جوں ہمارے ہاں صنعتیں قائم ہوں گی، جو کہ اب بڑی سرعت سے قائم ہو رہی ہیں، یہ رجحان اور زیادہ بڑھے گا۔ چنانچہ یورپ کے کلچر کو ہمارا دل اور دماغ اپنائے یا نہ اپنائے ہم عملاً اسے اپنا لیں گے۔ اور ہم اس کو اپنانے پر مجبور بھی ہیں۔

یورپ کے کلچر سے مراد اس کی اچھی چیزوں کے بجائے اس کی بُری چیزیں نہیں ہیں جیسا کہ جماعت اسلامی کے بزرگ اسے بالعموم مسلمانوں کے سامنے پیش کرنے کے عادی ہو چکے

ہیں، یورپ کا کلچر مشتمل ہے اس کے نظم و نسق حکومت، سائنس، فلسفہ اور آرٹ پر۔ جیسا کہ پروفیسر جرمانوس نے لکھا ہے، اور اب تو دولت کی ایک حد تک منصفانہ تقسیم، معاشی انصاف، معاشرتی ناہمواریوں کو دور کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ صحیح معنوں میں جمہوری نظام حکومت کا قیام بھی اس یورپی کلچر کا جزو لاینفک بن گیا ہے۔ اگر پاکستان کے مسلمانوں کو مادی اور روحانی و معنوی دونوں لحاظ سے ترقی کرنا ہے تو انہیں اس کلچر کو اپنانا ہوگا۔ اپنانا ان معنوں میں کہ وہ شعوری طور پر اور ذہنی اور فکری اعتبار سے اسے اپنائیں اور اپنانے کے اس عمل کو صحیح اور جائز سمجھیں، اور یہ محسوس نہ کریں کہ کوئی چیز ان پر زبردستی تھوپی جا رہی ہے، یا وہ اسے کسی وجہ سے اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ گو ان کی طبیعت اسے پسند نہیں کرتی۔

یورپ کے اس کلچر کو اپنانے کے سلسلے میں جیسا کہ پروفیسر جرمانوس نے بار بار دہرایا ہے۔ انہیں اپنے سامنے اسلام کی مشعل کو رکھنا چاہئے اور اس کے قابل فخر تہذیبی اثاثے سے ذہنی، جذباتی اور رنگی لحاظ سے رشتہ قطع نہیں کرنا چاہئے۔

یہاں بے محل نہ ہوگا اگر اس بات کا ذکر کر دیا جائے کہ شاہ ولی اللہی کے سلسلے کے ایک بزرگ نے، جن کی عمر کا ایک حصہ برعظیم سے باہر دوسرے اسلامی ملکوں میں گزرا تھا۔ ۱۹۳۹ء میں واپس وطن پہنچ کر ہندوستان کے مسلمانوں کو کم و بیش یہی پیغام دیا تھا یہ بزرگ، مولانا عبیداللہ سندھی (وفات ۱۹۴۴ء) تھے آپ نے اپنے اہل وطن مسلمانوں کو بتایا۔

(۱) جغرافیائی اور علاقائی قومیت پر اپنی سیاست کی بنیاد رکھو۔ اور سیاسی پان اسلامزم کے رومانی تصورات سے، جن میں تم سال ہا سال سے مگن ہو قطع تعلق کر دو۔

(۲) اس قومیت کا روحانی اور اخلاقی اساس اسلام کے بنیادی اصول اور اس کی عالمگیر اور انسانیت پرور حکمت بناؤ۔

(۳) یورپ کے موجودہ تہذیب کو مادّی کہہ کر اسے اس کے صحیح مقام سے نہ گراؤ۔ تم یورپ کی سطحیت کے شکار ہو گئے ہو۔ یورپی مفکر کا ضمیر اعلیٰ تصورِ حیات سے کبھی خالی نہیں رہا۔

(۴) یورپ کی سائنس اس کی تنظیم اور اس کی صنعت کو اپناؤ اور اگر تم نے یہ نہ کیا تو تمہارا وجود اس دنیا میں باقی نہیں رہ سکتا۔ تم ریت کے ذروں کے ہوا میں اڑتے نظر آؤ گے[1]۔

محمد سرور
کراچی

---

[1] آخر میں دیکھئے ضمیمہ صفحہ ۱۵۱

ایک عالمی سلطنت ایک عالمی تہذیب

یہاں دریائے ڈینیوب پر واقع بوڈاپسٹ[1] کے اس خوبصورت شہر میں پہاڑیوں کے اندر ایک الگ تھلگ مزار ہے، جسے چاروں طرف سے دل کش ستونوں کی قطاروں نے گھیرا ہوا ہے۔ اس مزار کے بالکل متصل ترکی طرز کی ایک عمارت بنی ہوئی ہے۔ شہر کے شور و غل کی آوازیں ان ستونوں تک مشکل سے پہنچ سکتی ہیں، اس لئے قبر میں سوئے ہوئے بزرگ بڑے اطمینان سے محوِ استراحت رہ سکتے ہیں۔ اس مزار میں ایک مسلمان بزرگ گل بابا دفن ہیں، جو عثمانی ترکوں کے فتح مند لشکر کے ساتھ ادھر آئے تھے۔ اور یہیں بوڈا کے قلعے میں اس کی تسخیر کے تھوڑا ہی عرصہ بعد ۱۵۴۱ء میں ان کا انتقال ہوا۔ گل بابا کا مزار عقیدت مندوں کا مرجع ہے، اور اگرچہ ان کو یہاں دفن ہوئے صدیاں گزر چکیں اور بڑے بڑے انقلابات ہو چکے، لیکن اب بھی مشرق کے دور دراز ملکوں سے

---

[1] ہنگری کا دارالسلطنت

عقیدت مند اس مزار کی زیارت کے لئے کھنچے چلے آتے ہیں۔

صحرائے عرب کے ایک کنارے پر آباد مکۂ معظمہ وہ شہر ہے، جس میں اسلام نے جنم لیا تھا، اور جہاں سے نکل کر اس نے ایک قلیل عرصے میں مشرق قریب اور مشرق وسطیٰ کو حیرت انگیز طریقے پر فتح کر لیا، اور پھر ایک طرف شمالی افریقہ کے راستے وہ اسپین میں اور دوسری طرف ایران کے راستے مشرق میں چین کی سرحدوں تک پہنچا۔ مشرقی یورپ میں اسلام کی کشور کشائی کی آخری حد بوڈاپسٹ ہے اور یہیں بکتاشی درویشوں کے طریقے کے بزرگ گل بابا جو ساتھ ساتھ سپاہی بھی تھے یہ مزار ہے۔ جو مشرقی یورپ میں اسلامی فتوحات کے بعید ترین سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

مکۂ معظمہ سے بوڈاپسٹ تک کعبہ سے جبل الاذہار[1] تک، بلکہ یہاں ہمارے قدموں تک یہ سیلِ رواں جو اللہ کے فوق الادراک ارادے کے تحت شروع ہوا، صحرائے عرب میں سے گزرتا۔ دریائے نیل کے زرخیز کناروں کے ساتھ ساتھ، عراق کے گندم اگلنے والے کھیتوں اور گنگا کے مقدس پانیوں میں سے ہوتا ہوا قرطبہ، اشبیلیہ اور سات پہاڑیوں پر آباد روم کے قیصروں کے شہر قسطنطنیہ کو اپنا راہگذار بناتا بہتا اور سب کو اپنے ساتھ بہاتا چلا گیا۔ یہ بڑا فتح مندانہ سیلاب تھا، اس کی مثال اس چڑھتے ہوئے دریا کی تھی، جو اپنے سامنے آنے

---

[1] اسپین کا ایک مقام

والی ہر چیز کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے، اور جب وہ اترتا ہے تو اس کی سیراب کی ہوئی زمینوں سے رنگا رنگ شگوفے پھوٹ پڑتے ہیں، اسی سیلاب ہی کا کرشمہ تھا کہ وحشی اور اُجڈ عربوں نے ایک عالمی سلطنت کی بنیاد رکھی، اور جہاں ایک طرف اُن کی زبان اس وقت کی معلوم دنیا کے آخری کناروں تک پھیلتی چلی گئی، وہاں دوسری طرف انہوں نے نہ صرف اس زمانے کے تمام انسانی علوم کو حاصل کیا، اور ان سے فائدہ اٹھایا۔ بلکہ انہیں خوب ترقی اور جلا بھی دی، ساتویں صدی عیسوی میں دمشق کی اموی خلافت نے عربوں کی عالمی سلطنت کی سیاسی اور اقتصادی بنیاد رکھی، اور آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں عباسی خلافت[1] جس کا پایہ تخت بغداد منتقل ہو چکا تھا، عربی تہذیب کو وجود میں لانے کا باعث بنی۔

عربوں کی یہ تہذیب انتخابی یعنی خُذ ما صفا و دع ما کدر کے اصول پر مبنی تھی۔ انہوں نے ہر اس چیز کو منتخب کیا اور اپنایا جو قرونِ وسطیٰ میں ایک حد تک حریت پسندانہ رجحان کی حامل تھی، رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد تھا کہ "علم حاصل کرو، خواہ اس کے لئے تمہیں چین تک جانا پڑے"۔ چنانچہ نویں صدی ہجری میں عربوں کے ہاں بڑے وسیع پیمانے پر تراجم کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس کی وجہ سے عہدِ قدیم کے طبیعی علوم اور فلسفیانہ تصانیف محفوظ ہو گئیں۔ نیز عربوں کا علم قانون

---

[1] عباسی خلافت کے ابتدائی زمانے میں۔

ایک ایسے سانچے میں ڈھل گیا کہ اگرچہ وہ رومانی قانون سے ایک حد تک متاثر تھا۔ اب تک وہ قرونِ وسطیٰ کی اُس نظریاتی رُوح سے منسلک ہے، جس کی رُو سے ہر قانون کا اصل ماخذ ذاتِ الٰہی ہے۔ عربوں کے ہاں ذاتِ الٰہی کی ترجمانی قرآن اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کرتی تھیں اور مسلمان قانون سازوں کا کام یہ تھا کہ وہ قانون کے ان مقدس ماخذوں کی تشریح اور حالات روزمرہ پر اُن کی تطبیق کریں، قانون کے اس نظام کی بنیاد اخلاقیات پر رکھی گئی تھی، اور انسان کے فکر وعمل کی آزادی کو بلند تر ناقابلِ ادراک مشیئتِ الٰہی کا پابند قرار دیا گیا تھا۔ یہ مشیئتِ الٰہی ہر جگہ کارفرما ہے۔ اُسی نے ہمیں پیدا کیا، اور یہی اب ہماری رہنمائی کا فرض ادا کرتی ہے، اور اس دنیا میں جو لوگ اللہ کی اس مشیئت پر چلتے ہیں، اُن کو دوسری دنیا میں اس کا اجر ملے گا۔ اس مشیئتِ الٰہی کی حیثیت عہدِ قدیم میں ایک اندھی تقدیر کی تھی۔ لیکن اس کے بجائے اب اسلام میں وہ ایک رحمٰن ورحیم خداوند کی مرضی تھی، جو خبیر وعلیم ہے۔ اور اپنے ازلی وابدی مقاصد سے پوری طرح آگاہ ہے۔ اور وہ انسانیت کو صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت کرتا ہے اور انسانیت کو کسی حال میں بھی اس سے اِدھر اُدھر بھٹکنا نہیں چاہیے۔

یونانی و رومانی تہذیب میں سے سب سے بڑھ کر اس کے طبیعی علوم (نیچرل سائنس) تھے۔ جن سے عربی زبان میں لکھنے والے عرب

اور غیر عرب مسلمانوں کو نئے سے نئے سائنٹفک تحقیقات کرنے کا شوق پیدا ہوا، وہ طبیعات، علم کیمیا، الجبرا اور ٹکنیکل سائنس میں ایسے شاندار نتائج پر پہنچے کہ آج کے دن تک ان علوم کی مختلف شاخوں کی صدہا ٹیکنیکل اصطلاحات اپنے عربی الاصل ہونے کی یاد دلاتی ہیں۔ شروع شروع میں وہ فلسفہ میں یونانیوں کے شاگرد تھے، لیکن آخر میں وہ خود اس میں استاد بن گئے تھے، افلاطون اور اس کے بعد خاص طور سے ارسطو عربوں کے حقیقت پسند سامی ذہن کے زیادہ مطابق تھے، اس لئے ان دونوں فلسفیوں کی تصانیف کو انہوں نے زیادہ پڑھا، اور پڑھایا بھی، وہ فنِ تعمیر اور تزئین و آرائش کے فنون میں بھی انتخابیت کے اصول پر عامل تھے کہ جہاں سے کوئی اچھی چیز ملی لے لی لیکن ان میں بھی انہوں نے اپنا ایک نیا طرز ایجاد کیا، جسے "سارسینک" فنِ تعمیر کا نام دیا گیا ہے۔ یہ طرزِ تعمیر گو قدیم یونان کے فنی شاہکاروں کی مکمل ہم آہنگی و مناسبت کے درجے تک تو نہیں پہنچ سکا۔ لیکن تزئین و زیبائش اور تفصیلات کو اتمام تک پہنچانے کے سلسلے میں اس نے اپنایت اور انسیت کی ایک ایسی فضا پیدا کر دی، جو کلاسیکی دور کے فنی کارناموں میں مفقود تھی، عربوں کی اس عالمی تہذیب کو سب سے زیادہ فخر اپنی زبان پہ تھا، جس کا مثالی نمونہ قرآن مجید ہے، جو اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور اس دنیائے فانی کے شعراء کا کلام جس کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتا، اس تہذیب

کے منجملہ ادبی کارناموں کے ایک بہت بڑا کارنامہ الف لیلہ کی کہانیوں کا مجموعہ ہے، جو اخذ و انتخاب کا نچوڑ ہے، اور جس میں انجیل و توریت نیز ہندوستان، ایران، یونان اور مصر کی کہانیوں کو حیرت انگیز طریقے سے جمع کر دیا گیا ہے، الف لیلہ کا شمار اب تک مشرق کے زرخیز تخیل، اس کے شان و شکوہ اور اس کی سرد و سرمستی کی مثالی تصویر کے طور پر ہوتا ہے۔ اس تہذیب کی کوتہ دستیاں اور مجبوریاں بھی تھیں، بد قسمتی سے اس کے ادبی تخیلات رزمیہ شاعری اور ڈرامے سے زیادہ ہم آہنگ نہ ہو سکے؛ نیز اس کے ہاں تاریخ نویسی محض واقعات کے بیان اور سوانح نگاری تک محدود رہی۔

اس تہذیب کو اس کے سیاسی نقطہ نظر سے دیکھیں تو یہ نظر آتا ہے کہ مسلمان فرمانروا اسلام کی جمہوری روح کے برخلاف جو اس کی اصل اور جبلی روح تھی، مطلق العنان ہو گئے تھے، ان میں یہ تبدیلی مشرق کی قدیم ترین روایات کے زیرِ اثر ہوئی تھی، ان کی اس مطلق العنانی کے نقصانات نفع سے زیادہ نمایاں تھے۔ ایک فرماں روا کی خود رائی اور خبط اگر ایک طرف کسی غیر معمولی کارنامے کا باعث بنتا تھا، تو دوسری طرف اس کا نتیجہ ظالمانہ انتقام کی قسم کی بداعمالیوں اور ان کے مضرت رساں عواقب کی صورت میں نکلتا تھا، بادشاہوں کی یہ مطلق العنانی بالعموم قرونِ وسطیٰ کے مذہبی رجحانات کے عین مطابق تھی۔ چنانچہ اس اعتبار سے اس زمانے کے مسلمانوں اور یورپی عیسائیوں کے سیاسی اداروں میں

کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں یورپ پر مسلمان اقوام کے حملوں نے وہاں پاپائیت کے مذہبی ادارے کو مضبوط ہونے میں بڑی مدد دی، اور اسی کی وجہ سے یورپ کا جاگیردارانہ نظام بعد میں صلیبی جنگوں کی صورت میں مسلمانوں پر جوابی حملے کے لئے بھی منظم ہو سکا، ان صلیبی جنگوں میں عیسائی حملہ آوروں کے مقابلے میں مسلمان بہادر صرف لڑنے والے سپاہیوں کی حیثیت سے نہیں آئے تھے بلکہ ان کے آپس کے میل جول سے اور بھی مفید نتائج نکلے، بہت سی سائنٹفک معلومات، اور معاشرتی طور طریقے جو عیسائیوں نے ان جنگوں میں اپنے مسلمان مخالفین سے اخذ کئے، وہ اسی زمانے میں یورپ میں پہنچے تھے۔

جہاں تک تہذیب اور کلچر کا تعلق ہے، تیرھویں صدی کے وسط تک اس میں اسلام دنیا کے دوسرے ملکوں کے مقابلے میں سب سے آگے رہا ہے۔ اسپین میں عربوں نے پختہ بازار بنائے اور ان میں رات کو روشنی کا انتظام کیا، ان میں جو دولت مند تھے، وہ اپنے مکانوں کو پانی کے نلوں اور فواروں کی مدد سے ٹھنڈا رکھا کرتے تھے۔ اس کے مقابلے میں سبھی یورپ کے شہروں کے بازاروں میں لوگوں کو کیچڑ اور اندھیرے میں دھکے کھانے پڑتے تھے، مسلمانوں کے ہاں شفا خانے تھے، جہاں بیماروں کا علاج ہوتا۔ کتب خانے تھے جن سے طلب علم کی پیاس بجھائی جاتی۔ عرب دنیا کی مساجد میں جو درسگاہیں

ہوتی تھیں، اُن میں دینیات سے کر طب تک ہر اچھی اور مفید چیز پڑھائی جاتی تھی دمشق، بغداد، قاہرہ اور قرطبہ کے بازاروں میں لکڑی لوہے، چاندی، اور سُوت کا ایسے اعلیٰ پائے کا سامان تیار ہوتا، کہ وہ سکنڈے نیویا تک کی دور دراز کی ریاستوں میں جا کر بڑے مہنگے داموں بکتا، اس زمانے میں یورپ کا ٹکنیکل علم اور اس کی سائنس عرب مسلمانوں کے ان علوم کے مقابلے میں، ہیچ تھی۔

تیرھویں صدی کے وسط میں تاتاری فتوحات کا سیلاب آیا، اور وہ خلافت بغداد کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا، اس نے کتب خانے تباہ کئے، اور لوگوں کو غلام بنایا۔ عربی تہذیب کی شمع گو اس تاتاری طوفان کے بعد بھی کچھ عرصہ تک مصر اور مغرب میں جلتی رہی، لیکن نہ تو اسپین کی عربی ریاستیں اور نہ عثمانی ترک جو تاتاریوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے یورپ میں داخل ہوئے تھے، عربی تہذیب کی پہلی عظمت کو قائم رکھ سکے۔ جس طرح ایک ٹمٹماتا ہوا دیا بجھنے سے پہلے ایک لمحہ بھر کے لئے ذرا زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمان عربوں کے تخلیقی ذہن نے ختم ہونے سے پہلے ابن خلدون کی شکل میں اپنی آخری تابانی دکھائی۔ ابن خلدون پہلا شخص تھا، جس نے فلسفۂ تاریخ و اجتماع پر ایک معرکہ آرا کتاب لکھی اور اس طرح وہ ویکو، بوڈن اور انسانوں کی جغرافیائی تقسیم کے علم کے موجودہ فضلا اور ماہرین نفسیات کا صدیوں پہلے پیش رو بنا۔

امریکہ کا انکشاف، اور اسپین سے مسلمانوں کا اخراج ایک ہی وقت میں ہوا، بہرحال اِدھر مغربی یورپ میں مسلمانوں کے ہاتھ سے جتنا علاقہ نکلا تھا، اس کی کافی سے زیادہ تلافی مشرقی یورپ میں عثمانی ترکوں کی فتوحات سے ہوگئی۔ انھوں نے ایا صوفیا کے گنبد پہ ہلالی پرچم گاڑھا، جو ایک ایسا کارنامہ تھا، جسے عرب مسلمان صدیوں کی جدوجہد کے بعد بھی سرانجام نہ دے سکے تھے۔ عثمانی ترکوں نے سردیا کو روندا۔ ہنگری کا ایک بڑا حصہ فتح کیا۔ اور ۱۴۵ سال تک بوڈاپسٹ اور ہنگری کے دوسرے شہروں کی چالیس مسجدوں کے مناروں سے اذانیں بلند ہوتی رہیں۔ اس زمانے میں گو ترکوں کی فوجی طاقت کا کوئی مقابلہ نہ کر سکتا تھا لیکن جہاں تک تہذیب اور کلچر کا تعلق ہے، اس میں نہ صرف یہ کہ وہ ایک قدم آگے نہیں بڑھے بلکہ وہ اس مقام پر بھی نہ پہنچ سکے، جس پر ان سے پہلے عرب اور ایرانی فائز رہ چکے تھے۔ عثمانی ترکوں کی فتوحات جوار بھاٹا کی اُٹھتی ہوئی لہر کی طرح تھیں، جسے آخر کو اترنا ہی تھا، وہ لہر اُتری، لیکن اس نے زمین کو زرخیز نہ بنایا، جو تہ آب رہ چکی تھی۔ بہرحال اس صورتِ حال کی ذمہ داری صرف ترکوں پر نہیں ہے۔

امریکہ کے انکشاف تک یورپ کا رخ صرف مشرق کی طرف رہتا تھا، یہ مشرق ہی کی سرزمین تھی، جہاں سے یورپ کو روشنی، مذہب اور سائنس نصیب ہوئی، نیز مشرق ہی سے اس پر دشمنوں کے حملے ہوتے رہے،

مشرق کے ان مسلسل حملوں کو روکنے کے لئے یورپ کو اپنے پاؤں پر جم کر مقابلہ کرنا پڑا، اور اُسے اپنے پیچھے فرار کی کوئی راہ نظر نہیں آتی تھی، کیونکہ بحراوقیانوس کی بے پایاں موجیں اس کا راستہ روکے ہوئے تھیں۔ قرونِ وسطیٰ کے زمانے کے لوگوں کا جغرافیائی تصوّر آج ہمیں کچھ عجیب سا لگتا ہے، لیکن قرونِ وسطیٰ کے ایک آدمی کے لئے برطانیہ کے مغرب اور مراکش کے جنوب میں بحراوقیانوس کی پُراسرار موجوں کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ اُس زمانے کے آدمی کا زندگی کے متعلق تصوّر اتنا ہی بے ہوچ اور چپٹا تھا، جتنے اس کے جغرافیائی تصورات یک طرفہ اور محدود تھے۔ لیکن اُس زمانے میں اسلامی سائنس اس سے واقف تھی کہ زمین چپٹی نہیں، گول ہے۔

یورپ کا عروج

جہازرانی کے ذریعہ زمین کے گرد چکر لگانے میں کامیاب ہونے کے بعد زمین کے متعلق یورپی عالموں کا یہ یک طرفہ اور چپٹا تصور ختم ہوگیا، اور اس کی جگہ زمین کے گول ہونے کے تصور نے لے لی۔ یورپ نے اُس وقت تک خود اپنی سرزمین میں اسلام کے حملوں کو سامنے سے روکا تھا، لیکن اب یورپی مہم چلے خود اسلامی دنیا پر دائیں بائیں سے بڑھے، اور اس پر پیچھے سے حملے کرنے لگے۔ ان جغرافیائی انکشافات کے ساتھ ساتھ یورپ میں قرونِ وسطیٰ کا جامد مذہبی اندازِ فکر بھی ختم ہوگیا، اور اس کی جگہ تشکک اور تجربیت نے لے لی۔ بیکن نے سائنس کو آسمان سے زمین پر اُتارا اور سائنس نے بجائے روایتی سند کے منطقی استدلال کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنایا اور اقتصادی زندگی میں ابتدائی زرعی معیشت کی جگہ جس کی عنانِ قیادت کلیسائی نظام اور زمین کی ملکیت کی شکل میں اس کے وظیفہ پانے والے

پادریوں کے ہاتھ ہی تھی اور وہی اس سے فائدہ بھی اٹھاتے تھے، سرمایہ دارانہ اور صنعتی طریق پیداوار نے لی، یہ سب تبدیلیاں سفید نام عیسائیوں کے یورپ میں ہوتی رہیں، اور پُر عجائب مشرق کو انہوں نے چھوا ہی نہیں، جہاں وقت، عوام الناس اور وہ کام جو انسانی ہاتھوں سے سرانجام پا چکے تھے، تمام کے تمام گہری نیند اور جمود میں مستغرق رہے۔

سترھویں صدی کے آخر میں اسلام کی فوجی طاقت کو دھکا لگتا ہے، اور اٹھارھویں صدی میں یورپ کی فوجی سائنس مسلمان اقوام کے فن جنگ پر قطعی طور پر سبقت لے جاتی ہے، اس زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک انگریزی دستہ نے ہندوستان کے مسلمان فرماں رواؤں کی دس ہزار فوج کو شکست دی، کیونکہ موخر الذکر فرماں رواؤں نے پچھلے ایک سو پچاس سال میں نہ تو سامان جنگ میں اور نہ فن جنگ ہی میں ترقی کی طرف ایک قدم بھی بڑھایا تھا۔ مسلمانوں کی زبردست سلطنتیں یورپی فوجوں کے سر توڑ حملوں کی تاب نہ لا کر پاش پاش ہو گئیں۔ ہندوستان انگریزوں کی نوآبادی بن گیا، اور یہ انگریزوں کی کسی معنوی سربلندی کی وجہ سے نہیں، بلکہ ان کے دھوکے اور فریب سے ہوا۔ ترکی سلطنت کے وجود کا انحصار جس نے ۱۵۱۷ء میں فتح مصر کے بعد خلافت کا لقب اور اس کی حیثیت اختیار کر لی تھی، بتدریج اسٹریا اور روس کے رحم و کرم پر ہوتا

گیا۔ اسلام اپنی تہذیبی توانائی کھو کر سیاسی لحاظ سے بھی پارہ پارہ ہو گیا، اور اس کی وجہ صاف ظاہر ہے، کیونکہ ہر سیاسی طاقت کی اساس اخلاقی اور معنوی تہذیب پر ہوتی ہے، اور جب کسی قوم کی اخلاقی اور معنوی تہذیب کو زوال آ جاتے تو اس کی سیاسی طاقت کا رُو بہ زوال ہونا یقینی ہو جاتا ہے۔

اُس وقت تک فوجی سائنس اور فنِ جنگ میں اسلامی مشرق اور یورپ کے درمیان جو تفاوت پیدا ہو گیا تھا اس سے کہیں زیادہ نمایاں اور زبردست وہ تفاوت ہے جو اٹھارھویں صدی کے آخر سے معنوی اور روحانی امور میں یورپ اور اسلامی مشرق کے درمیان چلا آتا ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد یورپ میں کلاسیکی رُوح نے فنون کو ترقی دے کر اتنی بلندی پر پہنچا دیا کہ اب تک وہ اس سے آگے نہیں بڑھے۔ یورپ کا گاتھک طرزِ تعمیر قرونِ وسطیٰ کی کلیسائی دنیا کے علیحدگی پسند اور جامد فکر کا ایک رمزیہ پیکر بن کر رہ گیا تھا، اور اس میں مزید ترقی کا کوئی امکان نہ رہا تھا لیکن بعد میں اسی کے نقشِ قدم پر یورپ میں نئے سے نئے دنیاوی طرز ہائے تعمیر وجود میں آتے رہے، اور مصوری، مجسمہ سازی، اور موسیقی کے فنون پہلو بہ پہلو بڑی تیزی سے ترقی کرتے اور یورپ کی ترقی پسند رجحان رکھنے والی روحانیت کی بھوک کو تسکین دیتے رہے۔ اس ضمن میں صرف اتنا اشارہ کافی ہے، کیونکہ یہ تمام امور سب کے جانے بوجھے ہیں۔ اس

زمانے میں یورپ کی تمام زبانوں میں سینکڑوں لافانی ادبی شاہکاروں کی تخلیق عمل میں آئی، شیکسپیر، ولیمنائن، گوئٹے اور ڈانٹی کے رزمیہ شاعر اور ڈرامہ نگار ادیب نے نئے سے نئے اسلوب اور زندہ جاوید ادبی خزینوں کو وجود بخشا، ادب اور فنون کے ان ناقابل مسابقت کارناموں کے علاوہ عقلی اور طبیعی علوم بھی ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتے گئے۔

سفرناموں کی اشاعت نے دُور دراز ملکوں میں بسنے والے لوگوں کو دیکھنے کا شوق پیدا کیا، اور اسی سے آگے چل کر نوآبادیوں پر قبضہ کرنے کا سلسلہ شروع ہُوا۔ امریکہ اور آسٹریلیا معلوم دنیا کے حصّے بن گئے، اور ان کے ساتھ ہندوستان کو بھی شامل کر لیا گیا، اور اس طرح یہ سب ملک، فرانس، ہالینڈ اور برطانیہ کی نوآبادیاں بن گئیں اور جُوں جُوں وقت گزرتا گیا۔ یورپ میں فلسفہ، علم النفس، علم آثارِ قدیمہ اور تاریخ تہذیب و تمدن کے ذخیرے بڑھتے چلے گئے۔ اور اقتصادی زندگی کے لئے بھی نئے میدان کھلتے گئے۔ جب ہم ان عقلی علوم کا مقابلہ یورپ کی ٹیکنکل ایجادات کے اس لامتناہی سلسلے سے کرتے ہیں، جنہوں نے دنیا کی پوری کایا پلٹ دی اور مشینی صنعتوں کو اس قدر فروغ دیا تو یہ عقلی علوم بالکل بے حقیقت نظر آتے ہیں، یورپ نے ان ایجادات کی مدد سے نیک اور دین دار اسلامی مشرق کو پہلے اقتصادی طور پر اور بعد میں سیاسی طور پر غلام بنایا۔ مشینی صنعت

نے صنعتی اصول پر منظم شدہ یورپ کی مصنوعات سے مشینوں سے چلنے والے آلاتِ حمل و نقل کے ذریعہ اسلامی دنیا کے بازاروں کو جو اس وقت تک قرونِ وسطیٰ کی اجتماعی معیشت میں زندگی گزار رہی تھی، اس طرح بھر دیا کہ مشرق کی ہاتھ سے بنی ہوئی خوبصورت مصنوعات ان مشینی مصنوعات کے مقابلے کی تاب نہ لاکر ختم ہو گئیں۔ انقلابِ فرانس نے بڑے وسیع پیمانے پر یورپ کی اجتماعی روح کو بدل دیا، اور عہدِ حاضر کی آزاد منشانہ اور تجزیہ کرنے والی فکری روح نے تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا، انقلابِ فرانس کے گوناگوں مناظر نیز میرابو، رابسپیر اور نپولین جیسی تاریخی شخصیات اور وی آنا کانگرس سے موجودہ سرمایہ دار، استعمار پسند اور قومیت پرست یورپ جنم لیتا ہے لیکن یورپ کا یہ معنوی احیاء بھی ان ٹیکنیکل ایجادات کے مقابلے میں جنہوں نے ایک یورپی انسان کو مادی دنیا کا حاکم اور فرماں روا بنا دیا ہے اب بے حقیقت نظر آتا ہے، خوش قسمتی تھی کہ یورپ میں یہ ٹیکنیکل ایجادات اس کی قومی آزادی کے بعد ہوئیں، جس کی وجہ سے یورپی اقوام ہولناک تباہی سے دوچار ہوئے بغیر ان ایجادات کو برداشت کرنے اور ان کے اقتصادی ردِ عمل کا بار اٹھانے کے قابل ہو گئیں۔

اسلامی مشرق

اس تمام عرصے میں اسلامی مشرق گہری نیند سویا رہا۔ ابن خلدون کے بعد سے جس کا انتقال ۱۴۰۶ء میں ہوا، اسلامی مشرق نے دنیا کے سامنے پہلے کی طرح کوئی بڑے اعلیٰ پیمانے کے تخلیقی کارنامے پیش نہیں کئے۔ اس کی صنعتیں بھی زمانے سے پیچھے رہ گئیں اور اس کی اقتصادی زندگی خام اجناس پیدا کرنے والی ابتدائی زرعی معیشت کی مذہبی روحانی فضا میں کھوئی رہی۔ بے شک آپ کو اب بھی کہیں کہیں دولت مند مسلمان ملیں گے لیکن یہ اپنی دولت ان لوگوں کی پسینہ کی کمائی سے حاصل کرتے ہیں، جن کی حیثیت ایک تباہ حال ستم رسیدہ پرولتاری طبقے کی ہو گئی ہے اور یہ چند دولت مند بھی اپنی دولت کو اقتصادی نقطۂ نظر سے مفید طریقے پر استعمال میں نہیں لاتے کہ یہ اس طرح لوگوں کے ہاتھ میں پہنچے۔ مسلمانوں کی مساجد میں جو درس گاہوں کا کام دیتی ہیں، آج بھی وہی درسی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں جو ایک ہزار سال پہلے پڑھائی

جاتی تھیں۔ ان کے اخلاقی اور روحانی تنزل کی نشان وہی کے لئے اس سے زیادہ کیا عملی ثبوت ہوگا، کہ علوم کے نئے شعبوں سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ بلکہ وہ ان سے خائف ہیں۔

اٹھارھویں صدی کی ابتداء میں یورپی عالموں نے مشرق قدیم کے زیرِ زمین مدفون آثار اور اس کی ادبی یادگاروں کی تلاش شروع کی۔ انہیں وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر باہر لائے اور دنیا کو اُن سے متعارف کرایا، یہاں تک کہ آج اس کرۂ ارض میں کوئی ایسا مخفی کونا موجود نہیں جس میں رہنے والے انسانوں کی صحیح صحیح نسلی خصوصیات یورپی علماء کی جمع کی ہوئی ہمیں پڑھنے کو نہ مل جائیں، جب ڈنمارک کے ماہر آثارِ قدیمہ نیوبہر کو اٹھارھویں صدی کے آخری وسط میں جنوبی عرب یمن میں کتبات ملے، تو وہاں کا کوئی عرب شیخ انہیں پڑھ کر سمجھ نہ سکتا تھا۔ اس لئے اُسے ان کتبوں کی نقول جرمنی کے شہر لیکے میں بھیجنی پڑیں، جہاں سے فوراً ان کا صحیح حل بھیج دیا گیا۔ عرب کی تاریخ، عربی علم اللسان، عرب کے جغرافیہ اور عربی میں علوم دینیہ کی کتابیں یورپی علماء نے قابلِ اعتماد اور نفع بخش طریقے پر چھاپیں، اور آج بھی یورپ ہی وہ سرزمین ہے، جہاں عرب، ایرانی اور ترک طالب علم یورپی استادوں کی زیرِ نگرانی اپنے کلچر کا خصوصی طور پر مطالعہ کرنے کے لئے آتے ہیں۔

مسلمانوں کا اندازِ فکر صدیوں سے روایاتِ ماسبق کا پابند

ہوگیا ہے۔ اور ان کی تربیت بھی کچھ اس طرح کی گئی ہے۔ کہ ان کے نزدیک علم کے معنی صرف اِدھر اُدھر کی جمع شدہ معلومات کو یاد کرنے کے ہیں، اس لئے مسلمان اہلِ علم دماغ سے زیادہ تر حفظ کرنے کا کام لیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ دماغ کو کسی طرح کی بھی تربیت دی جاسکتی ہے۔ اور جب مسلمانوں کے ہاں اُسے محض حفظ کرنے کی یک طرفہ مشق کرائی گئی تو اس نے آہستہ آہستہ اہلِ مشرق کو مغرب والوں کے مقابلے میں، جو اپنے ذہن کی تربیت تشکک اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی عقلی ترقی پہ کرتے ہیں، کامیاب ہونے کی ہر امید سے محروم کر دیا، چنانچہ جب انیسویں صدی شروع ہوتی ہے، تو اسلامی دنیا مکمل جمود سے نڈھال یورپ کے قدموں پہ گری پڑی تھی، اور زہد و تقویٰ میں ڈوبا ہوا مشرق اہلِ یورپ کی معاشی اور سیاسی لوٹ کھسوٹ کا نشانہ بن رہا تھا۔

لیکن اسلامی دنیا میں یورپ کی یہی دخل اندازی تھی، جس نے آخرکار چیدہ اور منتخب مسلمانوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اپنے عوام اور اپنے مذہب کی خاطر اٹھیں اور اُن میں یہ بیداری خود رو نہیں تھی، چنانچہ جہاں جہاں یورپی تعلیم کی وجہ سے مسلمانوں کو یورپی افکار سے سابقہ پڑا وہاں ان کی بیداری نے سب سے زیادہ شورش انگیز صورت اختیار کی۔ گذشتہ صدی کے ساٹھویں سال میں ہم مسلمان اہلِ قلم کو سب سے پہلی بار اپنے اہلِ مذہب کو یورپ کی طرف توجہ دلاتے پاتے ہیں،

مسلمان قوم پرست جو اس وقت تک اپنی پرانی روایات کی زنجیروں میں کافی حد تک جکڑے ہوئے تھے، یہ سمجھتے ہوئے کہ مذہب ہی کے اختلاف نے مسلمان اقوام کو اتنا پیچھے ڈال دیا ہے اسلام اور عیسائیت کا مقابلہ کرنے لگے۔ وہ گزرے ہوئے دنوں کی عظمت کا ذکر کرتے، اور اس کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے۔ اس زمانے کے ان نئے نئے بیدار ہونے والے مسلمانوں کی کتابوں میں خواہ وہ ہندوستانی ہوں یا ترک یا عرب، مشرقی رومانیت کی بڑی فراوانی ہے۔ اور اسی وجہ سے ان کے ساتھ اُن لوگوں کو بھی پُر خلوص ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے، جو بڑی سختی سے تجزیہ کرنے والے ذہن سے ان کی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں، لیکن یہ مسلمان اہل قلم مسلمانوں کے حقیقی اسباب زوال پر روشنی نہیں ڈالتے کیونکہ وہ خود ان حقائق سے کئی صدیاں ہوئیں، منقطع ہو چکے تھے۔ سید امیر علی سے لے کر جمال الدین افغانی تک سب کے سب یورپ کی مادی ترقی کو ہی مشرق پر اس کے غلبے کا سبب قرار دیتے ہیں، اور اسی وجہ سے ان کے نزدیک یورپ اسلامی دنیا کو معاشی اور سیاسی دونوں اعتبار سے لوٹ کھسوٹ رہا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس بات سے زیادہ سچائی سے اور کوئی چیز دور نہیں ہو گی۔ یہ ایک قدرتی امر ہے کہ مسلمان مصنفین جو مسلم ماحول میں رہے ہوں، اور جنہیں یورپی اندازِ فکر سے ذہنی طور پر واسطہ نہ پڑا ہو اور نتیجتاً انہیں اس کا صرف ظاہری رُخ ہی دیکھنے کا موقعہ ملا ہو، وہ

سبب اور نتیجے کو الگ نہیں کر سکتے، جب کہ وہ نتیجہ بہت سے امور سے مترتب ہوا ہو۔ دراصل آج کی اسلامی دنیا میں سب سے زیادہ جاذبِ توجہ اور نمایاں چیز یورپ والوں کا سیاسی تسلط ہے۔ اور اسی لئے یورپی تعلیم پائے ہوئے مسلمان اپنے عوام کی پُر مصائب زندگی کا سب سے بڑا سبب یورپ کے اس سیاسی تسلط کو قرار دیتے ہیں، اور یوں بھی یورپی کلچر کی سطحی کامیابیاں مثال کے طور پر کھیل، سینما اور سیاسیات ایک عام مشرقی آدمی کے خیالات اور روزمرہ کی زندگی پر کہیں زیادہ گہرا اثر ڈالتی ہیں، بمقابلہ ہمارے کلچر کی صحیح معنوں میں قابلِ قدر چیزوں کے۔

بہرحال یورپ ہی کے تسلط نے مشرق میں بیداری کے آثار پیدا کئے، اور اب وہ یورپ کے مقابلے کے لئے سخت جدوجہد کر رہا ہے، لیکن بدقسمتی یہ ہے، کہ یورپی کلچر کے معاملے میں مشرق بُری طرح احساسِ کمتری میں گرفتار ہے، اس ضمن میں مسلمانوں کی طرف سے عجز و انکسار کا جو اظہار ہوتا ہے، وہ یوں سمجھ میں آجاتا ہے جب ایک طرف ہم ہندوستان، مصر اور فرانسیسی مقبوضات کے یورپی حصوں میں پرشکوہ محلات آسمان سے باتیں کرتے دیکھتے ہیں اور دوسری طرف ہمیں ٹوٹی ہوئی جھونپڑیوں میں ملک کے اصل باشندے بیماریوں کی اذیتیں برداشت کرتے نظر آتے ہیں، پرانی عمارتوں کے آثار غلیظ گلیوں میں غفلت کا شکار بنے دبکے پڑے

ہیں، اور گذشتہ عظمت کی متواتر یاد مسلمانوں کے دلوں کو جو روحانی اور مادی دونوں اعتبار سے تباہ حال پرولتاری طبقے کی حالت کو پہنچ چکے ہیں برابر ستاتی رہتی ہے۔ ان دونوں طبقوں کا آپس کا یہ فرق اتنا زیادہ نمایاں ہے کہ اس کو دیکھ کر مشرقی مفکر اور مصنف بے تاب ہو کر مسلمان عوام کے حقوق کی حفاظت کی خاطر میدان میں کود پڑتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو وہ سیاسی حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں وہ اپنی تحریروں میں یہ غلطی کر جاتے ہیں کہ وہ موجودہ یورپی سلطنتوں کے طرزِ حکومت کے مقابلے میں بعض مشرقی مطلق العنان فرماں رواؤں کے مستبدانہ طرزِ حکومت کو اچھا کہنے لگ جاتے ہیں۔ اس معاملے میں ان لوگوں کی اپیل خاصی کامیاب رہتی ہے، کیونکہ اس وقت لوگوں کی جو قابلِ رحم حالت ہے اور بالخصوص گنجان شہروں میں بسنے والی تباہ حال پرولتاری آبادی کی، وہ تو سب کو معلوم ہے، لیکن جہاں تک مسلمانوں کی گذشتہ عظمت کا تعلق ہے، جس کی کہ یہ مسلمان سیاسی مصنفین تعریفیں کرتے ہیں اس کا لوگوں کو نہ روایات سے صحیح علم ہو سکتا ہے۔ اور نہ مطالعہ سے۔ چنانچہ ان کے لئے یہ بڑا آسان ہوتا ہے، کہ مسلمان حکومتوں کے ماضی کے متعلق کلیتہً ایک غلط تصور قائم کریں، جو صرف دلکش ہی نہیں، بلکہ بظاہر مشرقی روح سے زیادہ ہم آہنگ بھی ہوتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ کسی شخص کو

اس کی مرضی اور مزاج کے خلاف خوش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ واقعہ ہے کہ یورپی طرزِ حکومت مخصوص باقاعدگی کی وجہ سے قطعی طور پہ اہلِ مشرق کو پسند نہیں۔ ایک مسلمان فرماں روا مملکت کی دنیاوی ذمہ داریاں اپنے سر نہیں لیتا تھا۔ وہ معاملاتِ حکومت صدرِ اعظم کے سپرد کر دیتا، جو سب سے اوپر اور سب سے زیادہ طاقت ور ہوتا۔ یہ سب سے بڑا اور سب سے زیادہ طاقت ور عہدے دار، جو اکثر ایک ایمان دار اور خدا ترس ہوتا، اُسے بڑی ناشکر گزاری سے حرم کی کسی خوبصورت خاتون کے کہنے پہ کسی بھی لمحے برخاست کیا جا سکتا یا اس کے گلے میں ریشمی ڈوری کا پھندا ڈال کر دوسری دنیا میں بھیجا جا سکتا تھا۔ ایسے موقع پہ یہ صدرِ اعظم نماز کے لئے سربسجدہ ہو جاتا، اور اس طرح بڑی خاموشی سے موت کا سامنا کرنے کی تیاری کرتا۔ اکثر آبادی کے سب سے نچلے درجے سے سلطنت کے اِن بلند مناصب پہ لوگ پہنچتے، اور اس کے بعد وہاں سے یہ یک بارگی غائب ہو جاتے۔ اسلامی دنیا میں حکومت کے کاموں کو چلانے کے لئے افسروں کا ایک مستقل طبقہ (سول سروس) کہیں وجود میں نہیں آیا، بلکہ یوں ہی اتفاق سے بعض لوگ ترقی کر کے اوپر پہنچ جاتے، اور پھر ان کو واپس دھکیل دیا جاتا، اور ان افراد کو یہ سیاسی اہمیت یا تو ذاتی قابلیت سے حاصل ہوتی، اور یا محض قسمت ان کی یاوری کرتی، آدمیوں کے اس طرح کے انتخاب اور ان سے اس قسم کے سلوک کا یہ انوکھا طریقہ جو ہمیں

بے انصافی پر مبنی نظر آتا ہے، ایک مشرقی کے دل میں برہمی اور ناراضگی کے جذبات پیدا نہیں کرتا، یہ لوگوں کی قسمت کو اللہ کی مرضی سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ چنانچہ یوں نظر آتا ہے، جیسے مشرقی ذہن کی گرفت سے نظم و نسق کا احساس جاتا رہا ہے

مسلمانوں کی معاشری زبوں حالی

ایک مسلمان کا گھر قابلِ رحم "تذبذب اور بے یقینی کا نمونہ ہے" اور اس کی زندگی محض اتفاقات کے سہارے چلتی ہے۔ جب اس کے من میں آتا ہے، کام کرتا ہے، اور جب اسے تھکاوٹ محسوس ہو، سو جاتا ہے۔ وہ دن یا رات کے کسی حصے میں گہری نیند سو جانے کی صلاحیت رکھتا ہے، اور گردوپیش کی زندگی کا شور اس کی نیند میں بالکل مخل نہیں ہو سکتا، اور نہ اس کی جمالیاتی حِس کو اس بات سے ٹھیس لگتی ہے کہ ایک عالی شان محل کے بالکل متصل گندگی کے ڈھیر کے ڈھیر پڑے ہیں۔ البتہ اسے روزانہ کام کے لئے پہلے سے طے شدہ پروگرام سے بے شک بڑی تکلیف ہوتی ہے، لیکن ان باتوں کے باوجود ایک مشرقی ایک یورپی سے زیادہ زندگی بسر کرنے کے فن کو جانتا ہے اور ہمیں اس کی یہ ادا شاعرانہ اور رومانیت پرور نظر آتی ہے (اور اپنے مشرقی بھائی پر اس معاملے میں ہمیں رشک بھی ہے) لیکن اس کی

یہ رہبانیت، عام جہالت، وباؤں اور دوسری امراض کی وجہ سے جنھوں نے اُس میں اہلِ یورپ کا مقابلہ کرنے کی سکت کو بہت کم کر دیا ہے، اذیت ناک حد تک پہنچ گئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم مسلمانوں کی گھریلو زندگی کی افسوس ناک پس ماندگی بھی دیکھتے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں ایک مشرقی گھر کا فرنیچر اپنی مخصوص وضع میں مغربی گھر کے فرنیچر سے کم درجے کا نہیں ہوتا تھا، بلکہ وہ اکثر اعتبار سے آخر الذکر سے اعلیٰ ہوتا تھا۔ ایک غریب سے غریب مشرقی کے گھر میں بھی آپ کو ایک غسل خانہ ملتا تھا، جہاں اس گھر والے شریعت کے مقرر کردہ آداب کے مطابق نہا سکتے تھے۔ حماموں کا رواج بھی دوبارہ اسلام نے عام کیا، کیونکہ رُومی کلچر کے زوال کے بعد یہ طریقہ تقریباً ختم ہو رہا تھا۔ قالین سازی کی صنعت جو آج کے دن تک مشرق کی سب سے زیادہ مکمل گھریلو صنعت ہے، مشرقی آسائش کا تصوّر پیش کرتی ہے۔ مشرق میں نوع بنوع اور لذیذ سے لذیذ کھانے پکانے کے شوق نے طبّاخی کے فن کو قابلِ تعریف حد تک درجہ تکمیل پر پہنچا دیا۔ لباس اور لباس کے لوازم کو نفاست سے تیار کرنے میں یورپی اقوام سے مسلمان کہیں آگے بڑھ گئے تھے۔ لیکن آج یہ حالت ہے کہ مشرق کے شہر اپنے بھونڈے مکانوں اور کھنڈرات کی طرح کی جھونپڑیوں کے ساتھ ایک ڈراونا منظر پیش کرتے ہیں۔ آپ کو گھروں میں غسل خانے اب بھی ملیں گے، لیکن وہ بہت خستہ حالت میں ہوں گے، جن کو دیکھ کر یہ خیال ہوتا

ہے کہ مشرقی آدمی صفائی کا احساس ہی کھو چکا ہے۔ اس کے کشادہ ملاقاتی کمروں میں تم کو "کوچ" پڑے ہوئے ملیں گے، ان پر قیمتی کپڑا ضرور منڈھا ہوا ہوگا لیکن اوّل تو وہ تار تار ہو چکا ہوگا، اور دوسرے اس کے انتخاب میں کوئی خوش ذوقی نہ ہوگی۔ دیواروں اور فرنیچر کی صفائی نہ ہوگی، اور خانہ داری کا سیقہ سطحی اور بے ڈھنگا ہوگا اور پھر فرش پہ بیٹھ کر ہاتھ سے کھانا کھانے کا طریقہ اب اتنا دل کش اور شائستہ نہیں جتنا کبھی پہلے ہوتا تھا، اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے یورپی سیاح یہ غلط تاثر لے لیتے ہیں کہ مشرقی کھانے کھانے کے قابل نہیں ہوتے۔ ان مقامات میں جہاں اسلامی روایات نسبتاً اپنی اصلی حالت میں ہیں، جیسے ایران، افغانستان اور عرب، وہاں اب بھی بہت اچھے پکے ہوئے کھانے مل سکتے ہیں، البتہ کھانے کے برتنوں کی نوعیت سے ایک عام بے ترتیبی ضرور جھلک رہی ہوگی۔ اس ضمن میں سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ ان مسلمان ملکوں میں جو یورپ والوں کے زیر اثر آ چکے ہیں، پرانے وقتوں کی جو اچھی اور عمدہ چیزیں ہیں وہ تو متروک ہو گئی ہیں، اور یورپ سے انہوں نے جو باتیں اخذ کی ہیں، ان کی جڑیں ابھی پوری طرح زمین میں نہیں گڑھیں، چنانچہ ان ملکوں میں ایک مخلوط اور نقلی سا اسلوب زندگی اختیار کر لیا گیا ہے۔ اور یہ مذاق کی پستی مشرقی عیسائیوں میں بھی اسی طرح پائی جاتی ہے۔

معاشرتی زندگی سے مسلمان عورتوں کی علیحدگی نے انہیں ذہنی

ترقی سے محروم کر دیا ہے، وہ لکھ پڑھ نہیں سکتیں، ان کی زبان غلطیوں سے پُر ہوتی ہے، اور ان کا بچوں کو پرورش کرنے کا طریقہ بے حد فرسودہ ہے، ایک مسلمان بچہ جو بالعموم اپنی ماں کے زیرِ سایہ نشوو نما پاتا ہے، جب وہ برابر یہ دیکھتا چلا آتا ہے کہ گھر کی عورتیں کسی غیر مرد پر نظر پڑتے ہی جھٹ بھاگ کھڑی ہوتی ہیں، تو قدرتی طور پر اس سے بچے میں بزدلی پیدا ہو جاتی ہے، اور اس میں یہ شرمیلاپن جوانی تک رہتا ہے، خاص طور سے جب اسے ایسی عورتوں سے دوچار ہونا پڑے جن کی وہ بجا طور پر عزت نہیں کر سکتا۔ عورت جو اسلام کے صحیح تصور کے مطابق عزت و احترام کی مستحق تھی، عملی زندگی میں دوسرے درجے کے انسان کے پست معیار پر گرا دی گئی، جس کی کہ ہمہ وقت حفاظت ہونی چاہیئے تاکہ بدتمیز لوگ اس پر دست درازی نہ کر سکیں۔

کھاتے پیتے اور آسودہ حال مسلمان، اپنی ذہنی پیاس کو جو وہ اپنی بیویوں کی معیت میں نہیں بجھا سکتے، ناچنے والیوں اور گانے والیوں کی صحبت سے بجھاتے ہیں۔ مسلمانوں کی بلند آہنگ تفریحات کا منظر کوئی اتنا اچھا نہیں ہوتا، کیونکہ نہ ان کی موسیقی فنی بلندی تک پہنچ سکی، اور نہ اس کا مقصد روحانی آسودگی ہے، بلکہ اس کے پیشِ نظر محض دادِ عیش دینے کا ذریعہ مہیا کرنا ہے۔ اور بس۔

اور کم حیثیت مسلمان کو جب تفریح مقصود ہوتی ہے تو وہ خشک

منظر قہوہ خانوں کا رخ کرتا ہے، جہاں یا تو فحش قسم کے قصے سنتا ہے یا پُر خطرات مہموں کی پھیکی داستانیں، اور اس دوران میں اس کی بیوی خالی مکان میں اکیلی بیٹھی بے کار خیالات میں گُم اپنا وقت کاٹتی ہے۔ معاشرتی زندگی میں مرد اور عورت کی اس طرح کی علیحدگی نے اسلام میں انسانوں کی دو مختلف نسلیں پیدا کر دی ہیں، مرد جو مجموعی طور پر غیر ذمہ دارانہ رجحانِ زندگی رکھتے ہیں، اور عورتیں جو ذہنی اور اخلاقی دونوں اعتبار سے پس ماندہ ہیں۔ ایک مشرقی جب یورپ جاتا ہے، تو وہ وہاں کے بڑے شہروں کے ایوان ہائے نشاط کی حیات شبینہ کے طور طریقے سیکھ لیتا ہے، چنانچہ آج قاہرہ اور اسکندریہ میں رات گزارنے کی جو شاندار تفریح گاہیں ہیں، وہ عریانی اور رندی میں پیرس کی بدنام ترین تفریح گاہوں سے ہر لحاظ سے لگا کھاتی ہیں۔ جمعرات کی شام کو ہزارہا کاریں مسلمانوں کو لئے شراب خانوں اور رقص گاہوں میں پہنچتی ہیں، جہاں وہ کھلے بندوں یا پردے کی اوٹ میں شراب کے شغل کرتے ہیں، اور ان کی بیویاں مشرقی ماحول میں اپنے فرشوں پر بیٹھی تنہائی میں وقت گزارتی ہیں۔ آج مشرقی شہروں میں یورپی فلموں کے اکتا دینے والے جذباتی عشقیہ مناظر یورپی کلچر کے خلاف سب سے مؤثر پروپیگنڈا کا کام کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کو دیکھنے کے لئے ان شہروں میں بکثرت لوگ آتے ہیں، اور انہیں دیکھ کر اس غلط نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہر یورپی مرد اور عورت کی زندگی ان "سینمائی ہیروؤں" سے بالکل مشابہ

ہے جن کو وہ ان فلموں کے پردہ سیمیں پر دیکھتے ہیں۔

آج اس جدید طرز کے مشرقی شخص کی زندگی ان دو انتہا پسندیوں کے درمیان ڈانواں ڈول ہے۔ ایک طرف اس کی گھر سے باہر کی زندگی میں صرف ایک ترکی ٹوپی ہے جو اس کے مسلمان ہونے کی غمازی کرتی ہے۔ اور دوسری طرف اس کی گھر کے اندر یہ حالت ہے کہ وہ گھر کے زنانہ حصے سے اپنے مہمانوں کو اس طرح چوری چھپے گزارتا ہے کہ مبادا کہیں ان میں سے کسی کی نظر اس کی بیوی یا بیٹی پر اتفاقاً نہ پڑ جائے۔ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ یہ عادت مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے ایک ہی طرح تکلیف دہ ہے

ذہنی پسماندگی

انسانی تہذیب ایک نمو پذیر وحدت ہے۔ نیز علوم و فنون، مذہب اور معاشرت کا اقتصادیات اور ٹکنیکل چیزوں کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اور یہ چیزیں صدیوں کے ارتقاء کے بعد حاصل ہوتی ہیں علاوہ ازیں فطرت میں نہ تو شعوری طور پر رجعت پسندی ہے، بالکل اسی طرح جیسے اس میں شعوری طور پر ترقی پسندی نہیں، ہاں اس میں تبدیلی ضرور ہوتی رہتی ہے، جس کی کیفیت کا مطالعہ کرنا اور اس پر نگاہ رکھنا ہمارا کام ہے۔ بے شک ہم اس تبدیلی کے اسباب تلاش کر سکتے ہیں، لیکن ہم ان اسباب کو نہ تو پیدا کر سکتے ہیں اور نہ ان کو ایک خاص رُخ پر چلا سکتے ہیں۔ نیز جس قدر اس کا امکان ہے کہ چند نیک دل اچھے اچھے خواب دیکھنے والے افراد ہماری موجودہ یورپی میکانکی تہذیب کو عہدِ وسطیٰ کی معیشت اور دستی صنعت کی زیادہ پُرسکون اور ہم آہنگ دنیا میں پھر لوٹا دینے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ اتنا ہی کم اس کا امکان ہے کہ

مشرقی سیاست داں یا مصلح اپنے عوام کا کردار، ان کے غور و فکر کے طریقے اور ان کی زندگی کا معاشرتی اور اقتصادی ڈھانچہ ایک دن میں یورپ کے موجودہ معیار پر لاسکیں۔

اس میں شک نہیں کہ قرون وسطیٰ میں مشرق اور یورپ میں اتنا بُعد نہ تھا، جتنا آج کل ہے۔ یورپی پادری اور راہب جو اُس زمانے میں یورپی کلچر کے حامل تھے بعینہٖ اسی فکری دنیا میں رہتے تھے، جس کی بنیاد بندھے ٹکے عقائد اور ایک خاص قسم کی منطق پر تھی، جس میں کہ اُس زمانے کے مسجدوں میں واقع اسلامی مدارس کے شیوخ رہا کرتے تھے۔ ان پادریوں اور راہبوں نے عربی ذرائع سے اپنا مسیحی علم کلام پڑھا تھا فن حرب، صنعت و حرفت اور زراعت اور تجارت میں دونوں کے ہاں ایک ہی سا نظام رائج تھا۔ قرُون وسطیٰ میں مسیحی مغرب اور اسلامی مشرق ایک ہی جیسے اسلحہ سے ایک دوسرے کے خلاف لڑے تھے۔ بلکہ اس ضمن میں اسلامی علوم کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھے۔

اور اگر مسلمان علماء کے شاندار علمی کارنامے نہ ہوتے تو یورپ ابھی تک جہالت اور نکبت میں پڑا سڑا کرتا۔ کئی طویل صدیوں تک دنیا کی روحانی روشنی اسلامی ممالک ہی سے پھوٹتی رہی۔ اس کے بعد دنیا دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ چنانچہ جہاں یورپ مادی اور معنوی دنیا کی تسخیر کے لئے نکل پڑا۔ وہاں مشرق قدیم مذہبی کتابوں کی خشک تاویلات اور ان کی نقلیں کرنے میں لگا رہا۔ اس نے اپنے آپ کو اس حد تک ماضی کے

حوالہ کر دیا کہ وہ گویا اس کے اندر محدود ہو کر فرسودگی کی نذر ہو گیا
یورپ میں صدیوں تک چھاپہ خانوں میں شائقین کے لئے کتابیں چھپاکیں اور اس
کے بعد کہیں جا کر شیخ الاسلام نے ۱۷۲۹ء میں باقاعدہ فتوے کے ذریعہ
کتابوں کے چھاپے خانے کو عملِ شیطانی کے الزام سے مبری ہونا قرار
دیا۔ یورپ میں انجیل مقدس وہ کتاب تھی جسے سب سے پہلے چھاپا گیا
اور انجیل کے جو وہاں ترجمے ہوئے وہ مختلف زبانوں کی نشو و نما اور
ان کے ادب کی ترقی کا باعث بنے۔ اس کے برعکس اسلام قرآن مجید
کے دوسری زبانوں میں ترجمے نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان عوام سے الگ
تھلگ رہا۔ یہاں تک کہ آخر میں مصطفےٰ کمال کی اصلاحات نے اس مقدس
کتاب کو ان ترکوں کے لئے جو عربی نہیں جانتے تھے قابلِ فہم بنایا۔

بے شک وہ مادی اسباب جو مشرق اور مغرب کی علیحدگی کا باعث
بنے۔ مثلاً امریکہ کا انکشاف، بین الاقوامی تجارتی راستوں کی تبدیلی، اور
زرعی اجناس کی قیمتوں کے مقابلہ میں مشین کی بنی ہوئی اشیاء کا بہت زیادہ
نفع بخش ہونا فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس
بات کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مشرقی اقوام کی فرسودہ ذہنیت بھی
ان کے جمود اور معاشی افلاس کا بہت حد تک سبب ہے۔ سولہویں
صدی کے بعد سے مشرقی ذہنیت اپنی روائتی قسم کی تربیت کے زیر
اثر جامد بن کر رہ گئی۔ ایک مشرقی صرف جاننا چاہتا ہے۔ اسے سوچنے
اور شک کرنے کی خواہش نہیں ہوتی جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ خود

اپنے تجربے سے حاصل کئے ہوئے مفید اور صحیح فیصلے سے محروم رہتا ہے
اس قسم کی ذہنیت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے
ہاں تاریخ حب امدمانی جاتی ہے۔ اور اس کا مقصد مسلمہ قوانین کے
ذریعہ زندگی کی بدلتی ہوئی قدروں کی تشریح ہوتا ہے۔ تاریخ کو اس
طرح دیکھنے کا یہ دینیاتی تصور (عہد وسطیٰ کے کلیسائی تصور کی طرح) جس
میں انسان اقدر کے ہاتھ میں ایک بے ارادہ آلہ کار سمجھا جاتا ہے۔ اس حد
تک اثر انداز ہوتا ہے کہ زندگی کے اصل حقائق پس پشت پڑ جاتے
اور مدھم نظر آنے لگتے ہیں۔ بے شک اس قسم کی واقعات نگاری سے
قاری تاریخی معلومات کا مواد تو فراہم کر لیتا ہے لیکن اس سے اس میں
تاریخی نظر نہیں پیدا ہوتی۔ مشرق کے مؤرخین حافظے کے معاملے میں
منجملہ عجائبات تھے لیکن ابن خلدون اور البیرونی کو چھوڑ کر
باقی سب کے سب نے اپنے پڑھنے والوں میں یہ صلاحیت پیدا کرنے
کی کوشش نہیں کی کہ وہ واقعات کے اسباب اور ان کے باہمی
تعلقات کا کھوج لگائیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض مسلمان علماء نے
مسلمان اقوام کی پس ماندگی کے وجوہ کو اچھی طرح سمجھا۔ اور انہوں نے
تعلیم کے ذریعہ ان کو دور کرنے کی پوری کوشش کی۔ یہ دراصل ابن رشد
اور ابن ماجہ جیسے بڑے فلسفیوں اور اجتماعی نفسیات کے ماہروں
(اس زمانے کے مسیحی یورپ میں اس قسم کا نظم فکر مفقود تھا) کے
صحیح روحانی جانشین سمجھے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے سائنٹفک

عقائد ایسی زبان اور ایسے انداز میں پیش کئے جو عام لوگوں کی ایک بڑی تعداد کے لئے قابلِ فہم تھے۔

اس ضمن میں انیسویں صدی کے مسلمان مصلح جمال الدین افغانی شیخ محمد عبدہٗ اور ان کے کثیر التعداد شاگرد جو مصر کے ماہوار مجلہ "المنار" کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے، نیز توفیق صدقی اور فرید وجدی وغیرہ آتے ہیں۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ جدید نیچرل سائنس اور علم اجتماعیات کا رشتہ قرآن مجید کی کسی نہ کسی آیت سے ڈھونڈیں۔ اس طریق سے وہ مسلمانوں کی نظروں میں نئی تحقیقات کو حق بجانب بھی ثابت کر سکتے تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اس طرح اُن کے مذہبی عقائد کو بھی تقویت دینا چاہتے تھے۔

یہ طریق کار اپنے اجتماعی مقصد کے اعتبار سے حق بجانب تھا۔ ندامت زدہ مسلمانوں (میں انہیں بڑے مسلمان کہنے کی جرأت کرونگا) کی ذہنیت نے انہیں قرونِ وسطیٰ کے افکار کی تقدیر پرستی اور غلامی میں جکڑا ہوا تھا۔ اس ذہنیت کا مسیحی دنیا پر بھی ایک زمانے میں تسلط رہ چکا ہے۔ لیکن جدید یورپ میں یہ ذہنیت بڑی سرعت سے اپنی موت آپ مر گئی۔ جدید یورپ کی ابتدا اس نقطۂ نظر سے ہوتی ہے "چونکہ میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں"۔ اور پس ماندہ مسلمان اس اصول پر عامل ہے "چونکہ میرا عقیدہ ہے اور میرا علم ہے اس لئے میں ہوں"۔ چنانچہ وہ اپنے عقیدہ اور اپنے علم کے خلاف کوئی بات برداشت نہیں کر سکتا۔

ڈیکارٹ سے ہے کہ اب تک یورپ تنقید عقلی کی راہ پر گامزن ہے۔ اس نے روائتی اسناد کے بتوں کو توڑ دیا، اور ان کے پتھروں سے اس نے افکار و خیالات اور انسانیت کے نئے مندر تعمیر کئے۔

اسلام کا مذہبی قانون یعنی شریعت اسلامی جو انسانی زندگی کے نجی اور اجتماعی پہلوؤں کو معین کرتا ہے، آج بھی عربستان اور افغانستان میں جو دنیا کی پس ماندہ ترین ریاستیں ہیں رائج ہے۔ اس ماحول میں یہ قانون بہت کار آمد رہتا ہے۔ کیونکہ وہاں پچھلے ایک ہزار سال سے قانون اور معاشرتی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ لیکن جہاں بھی اس ماحول کی عمارت جس پر اس قانون کو کبھی مطابق کیا گیا تھا، اپنی اصلی بنیادوں سے اوپر اٹھی ہے وہاں زندگی زیادہ طاقتور ہوئی ہے۔ اور آخر کار اس نے اپنے آپ کو ایک ہی طرح کے سانچے میں ڈھلنے والے قالب سے آزاد کرا لیا ہے، اور اپنے تجربے اور اصل حقائق کی بنیادوں پر اپنے لئے آزادتر ارتقاء کا مطالبہ کیا ہے۔ ترکی، مصر، ہندوستان نیز شمالی افریقہ کی فرانسیسی نوآبادیات میں جہاں یورپی اور مسلمان ایک ساتھ رہے اور مشترکہ اقتصادی حالات سے متاثر ہوئے۔ وہاں صرف نکاح و طلاق اور وراثت کے قوانین ہی غیر متبدل رہے ہیں۔ ورنہ فوجداری اور تجارتی قوانین یورپی نظام قوانین (نپولین کوڈ) کے مطابق کر دیئے گئے ہیں۔ اب تو ایک آدمی کو بہت سے ایسے "جرائم" سے چشم پوشی کرنی ہی پڑتی ہے، جن کا ارتکاب مشرق میں

یورپی اقتصادی زندگی کے نفوذ کے بعد سے حتمی ہو گیا ہے۔ اسلام
کا مذہبی قانون روپے کے عوض نفع لینے کو سود سمجھ کر حرام قرار دیتا
ہے۔ لیکن زندگی کے لابدی تغیرات نے ایک عرصے سے اس قانونی
ممانعت کی بنیادیں کمزور کرنی شروع کر دیں۔ چنانچہ آخر اس حکم کو
بدلنا پڑا۔ بہر حال یہ مذہب اسلام کی لچک اور وسعت کا ثبوت تھا کہ
جدید معاشی مظاہر کو مقدس قانون سے ہم آہنگ کیا جا سکا۔ عیسائی
مذہب کے اقتصادی قانون نے بھی سود کو ممنوع قرار دیا تھا۔ (مسیحی
ضابطۂ قانون اور شریعت اسلامی دونوں کے دونوں عہد وسطیٰ کے
مذہبی اخلاقیات کے ماحول میں وجود میں آئے تھے) چنانچہ یہ ستم رسیدہ
یہودی ہی تھے جنہیں اس زمانے میں اس نفع بخش سودی کاروبار کی
اجارہ داری حاصل تھی۔ جب تیرھویں صدی میں لمبارڈ دیہ کے باشندوں
نے سودی کاروبار شروع کیا تو ان کو عام تحقیر و اہانت بلکہ تشدد تک
کا نشانہ بنایا گیا۔

آج کل مصر ہندوستان میں (ترکی کا تو ذکر نہ کیجئے) مسلمانوں
کے بڑے بڑے بنک چل رہے ہیں۔ جو کاروباری معاملات میں اس
قسم کے یورپی اداروں سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں۔ بنگال میں سو فی
صدی سود پہ مسلمان پٹھان سودی کاروبار کرتے اور ہندوؤں کی کھال
اتارتے ہیں اور شمالی ہندوستان میں اسی فیصد شرح سود پر ہندو بنئے
مسلمان کو قرض دیتے اور ان کا خون چوستے ہیں۔

وہ تدامت پسندانہ رُوح جو گذشتہ ایک صدی سے مُردہ رسوم سے بُری طرح چمٹی ہوئی ہے، اور جس کی کوشش ہے کہ انسانی فکر کو بدستور زنجیروں میں جکڑے رکھے اور جو کسی بھوُے بسرے دور میں ایک حد تک کارآمد تھی اس نے مسلمانوں میں ایک خطرناک ذہنی خلیج پیدا کر دی ہے جسے انہیں بات بات پہ پُر کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور اس کی وجہ سے مسلمان کے ضمیر اور اس کی گرد و پیش کی زندگی میں ایک مسلسل کش مکش رہتی ہے۔ وہ نہ اس ماحول میں ٹھیک طرح رہ سکتا ہے اور نہ وہ اس میں اپنی صحیح شخصیت کا اظہار کر سکتا ہے۔ ان کی اکثریت جاہل اور افلاس زدہ ہے۔ اور وہ اپنے دُکھوں کا مداوا توہمات اور نشہ آور چیزوں سے کرتے ہیں۔ اس لئے وہ بڑی آسانی سے ہر بلند آواز نیم ان پڑھ درویش کا تختہ مشق بن جاتے ہیں۔ جو تقدس کے بہروپ میں دیہاتی عوام کی رُوح اور دولت دونوں کو بے دریغ لوٹتا ہے۔ یہ متعصب افراد جو لوگوں کو جہنم کی آگ سے ڈراتے اور اللہ اور مذہبی عقائد کے نام سے ہر کافرانہ اصلاح کے خلاف وعظ و نصیحت کبھی بند نہیں کرتے۔ ہر معاشرتی اصلاح کی راہ میں روڑے اٹکاتے رہتے ہیں۔ اور ان کی یہ حرکات کچھ تو اپنی جہالت کی بناء پر ہوتی ہیں اور کچھ اپنے ذاتی مفاد کی وجہ سے۔ یہ لوگ چیچک کے ٹیکہ کے سب سے بڑے دشمن تھے۔ اور اس بات کو بڑی بے باکی سے علی الاعلان کہنے کی جرأت رکھتے تھے کہ چوہوں اور بیماریاں پھیلانے والے

دوسرے جانوروں کو مارنا دراصل اجنبیوں کا ایک بہانہ ہے بعض مسلمانوں کے زنان خانوں میں داخل ہونے اور ان کی عورتوں کی بے حرمتی کرنے کا۔ پس ماندگی پر اپنے اس اصرار اور سرنتے فکر کے ساتھ اسے گلا گھونٹنے کی حد تک اپنی اس دشمنی کو وہ بظاہر آڑ بناتے ہیں؛ اس بات کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے کہ مذہب اسلام ناقابلِ تغیر و تبدّل ہے۔ لیکن وہ اسلام کی رُوح کے پابند نہیں ہوتے بلکہ ان کا عمل سراسر اس کے خلاف ہوتا ہے۔ ان "مقدس" حضرات نے نفاق کی ایسی فضا پیدا کر دی ہے کہ لوگوں کے لئے اسلام ایک بوجھ سا بن گیا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مصلح تھے۔ جنہوں نے بڑے خلوص اور ایمانداری سے جہالت اور بُرائی کے خلاف جنگ کی اور اپنے پیغام ہدایت کے بارے میں اعلان فرمایا کہ وہ ابدی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ لازماً وہ ہر زمانے کے ساتھ مطابقت پیدا کر سکتا ہے چنانچہ یہ کسی طرح انسانی ترقی میں رکاوٹ نہیں ہو سکتا۔ اگر پستی و نکبت کے ان علم بر داروں کو اسلام کے دلائل کے ذریعہ ان کے دعاوی کے بطلان کا یقین دلایا جا سکتا تو رسول اللہ کے بہت سے اقوال ان کے سامنے پیش کئے جا سکتے تھے۔ جنہوں نے کہ مذہبا بُت پرستی کی مذمت اور مخالفت کی جو اس وقت بے محل ہو چکی تھی۔ اس کی وجہ سے جو سماج دشمن حالات پیدا ہو رہے تھے۔ جیسے قتل اولاد، غیر محدود شادیاں، نحاشی اور طبقاتی تعصبات، ان کے خلاف جہاد کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظروں میں اسلام کے معنی حالات کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے نہ تھے بلکہ اللہ کی مرضی پر حالات کو ڈھالنے کے تھے۔ چنانچہ جب آپؐ مدینہ میں قانون ساز اور اسلامی ریاست کے صدر بنے، تو آپؐ نے زندگی کے حقائق کے ساتھ اپنے آپ کو مطابق کرنے اور عقل سلیم اور اخلاقیات کی رُوح کے تجربات کو اساس عمل بنانے کا ایک شاندار نمونہ چھوڑا۔ کارلائل نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو فکر و عمل کے بڑے عظیم الشان "ہیروز" میں شمار کیا ہے۔ جن کا اپنی قوم کو بلند کرنے کا ذریعہ ان کے پیغمبرانہ الہامات تھے۔ ان الہامات نے مکی زندگی کے دوران میں اولاً مذہب کے ابدی اور زندہ جاوید اصول متعین کئے۔ دوسرے اعمال حسنہ کا دوسری زندگی میں جو اجر ملے گا اس کی وضاحت کی نیز ایک بلند ذات اور اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے سامنے مسئولیت کے احساس کا تعین کیا۔ اور جب آپؐ مدینہ پہنچے تو وہاں آپؐ نے روزمرہ کی زندگی کے قواعد مرتب فرمائے۔ اسلام نے اپنے ابتدائی دور میں تحقیق و جستجو کی آزادی اور رائے عامہ کو جسے ہم آج کل بجا طور پر "روح عصر" کا نام دے سکتے ہیں، انسانی زندگی کا فیصلہ کن معیار تسلیم کیا تھا۔ اسلام شروع ہی سے مابعد الطبیعاتی بندھے ٹکے اذعانی عقائد کی زنجیروں سے آزاد رہا ہے۔ اس میں اس طرح کے ترکیبی اور ہم آہنگ ارتقاء کے امکانات موجود تھے۔ کہ ابتدا ہی سے اس میں بندھے ٹکے عقائد کے معاملے میں تشدد بار نہیں پا سکا۔ معتزلہ تو مجرد علم دین کو مقدس ہی

نہیں سمجھتے تھے اور اگر سیاسی حالات ان کی علمی سرگرمیوں کو مفلوج نہ کر دیتے تو یہ اصول (میں منطقی طور پر سوچتا ہوں) مسلمان دماغوں ہی کے ذریعے یورپ میں داخل ہوتا۔

معتزلہ کی عقلیت کی تحریک بدعنوانیوں کا شکار ہو کر ختم ہو گئی۔ بعد کی اسلامی تاریخ میں ہم کہیں کہیں اس تحریک کے آثار پاتے ہیں۔ جہاں کہ کبھی کبھی اس کی شعاعیں بھڑک اٹھتی ہیں۔ اس معاملہ میں بھی مشرقی تفکر کا مخصوص طریقہ نمایاں نظر آتا ہے۔ مذہبی راسخ الاعتقادی نے مغرب اور مشرق دونوں میں ایک ہی سی سختی کے ساتھ طبعیات کی دنیا میں آزادانہ تحقیقات کا اگر ان سے کلیسا کی سلامتی اور اس کے اعلان کردہ مذہبی عقائد پر زد پڑتی تھی، گلا گھونٹا۔ اس طرح کے تحقیقات کرنے والوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جو اپنی تحقیقات اور کلیسا کی آویزش کا شکار بنے۔ دورِ حاضر میں گیلیو سے لے کر آج تک ایسے لاتعداد لوگ گزرے ہیں جن کی زندگیوں کا خاتمہ یا تو قید خانوں میں ہوا اور یا پھانسیوں پر۔ اور وہ محض اس لئے کہ وہ ایسے عقیدہ کو لے کر آگے آئے جسے عوام کا جمِ غفیر سمجھنے سے قاصر تھا۔ یا اس کا اپنے زمانہ کے قائم شدہ معاشرتی مفادات سے تصادم ہوتا تھا لیکن جہاں یورپ کی کلچرل تاریخ بہت بھاری تعداد میں ایسے شہداء کا ذکر کرتی ہے جنہوں نے عملی سائنٹفک تحقیقات کرکے انسانی ترقی میں بڑی مدد دی۔ یا انہوں نے فن و ادب کے ذریعہ جمود و رجعت پسندی کے خلاف جہاد

کیا۔ وہاں مشرق میں معاشرے کے ایسے ٹھیکیدار ہوتے ہیں جو مجرد دینیاتی اور مابعد الطبیعاتی دنیا میں ان کو خواب دیکھنے میں مستغرق رہے منصور حلاج کی زندہ کھال کھینچی گئی۔ کیونکہ انہوں نے اپنے اندر خدا کو پایا تھا۔ باب ۱۸۵۰ء میں ایران میں اس لئے گولی سے مار دیا گیا کہ وہ اپنے آپ کو امام موعود سمجھتے تھے، ہندوستان کے مرزا غلام احمد کا خود اپنے بارے میں یہ انکشاف تھا کہ مسیح اور کرشن کی روح ان کے اندر حلول کر گئی ہے۔ پچھلے چھ سو سال میں اسلامی ممالک میں متعدد مذاہب یا مختلف مذہبی فرقوں کے ہزارہا مخلص بانیوں تھیوسافیکل عاملوں اور درویشوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نیا انکشاف کرنے والا یا تخلیقی روح کا مالک پیدا نہیں ہوا جس نے انسانیت کو سائنٹفک علوم میں کوئی نیا طریقہ یا کوئی نیا علم دیا ہو۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ سمجھنا بہت بڑی غلطی ہوگی کہ اسلام بہ حیثیت ایک مذہب کے، مشرقی روح کی ترقی میں رکاوٹ رہا ہے۔ اسلام کے دینیاتی نظام میں جو ارسطو کی منطق پر مبنی ہے: نیز اس کے عمل میں ایک بھی ایسی شق نہیں جو روحانی اور طبیعی علوم میں فکری ارتقاء کو روکے بلکہ اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ اسلام ایک اصلاحی مذہب ہے، جو ہر قسم کے سائنٹفک تحقیقات کا خیر مقدم کرتا ہے۔ بے شک اس نے جاندار چیزوں کی تصویر کشی کو حرام قرار دے کر فنون پر پابندیاں عائد کر دی تھیں، جن کی رو سے مسلمانوں کے ہاں مجسمہ سازی بالکل ترقی نہ کر سکی

اور مصوری کا فن بھی بہت دب دب کر کچھ آگے بڑھ سکا اور موسیقی کی حالت اس لئے زبوں رہی کہ وہ محض تفریح طبع کا ذریعہ بن گئی تھی۔ اور معاشرہ میں موسیقار کی اتنی گری ہوئی حیثیت تھی کہ وہ مقدمہ میں بطور گواہ کے پیش نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک مذہب اور اس کے ماننے والوں پر اس مذہب کا جو اثر ہوتا ہے ان دونوں چیزوں کا انحصار صرف جغرافیائی، اقتصادی اور اجتماعی کوائف نہیں ہوتا جس میں وہ ماننے والے رہتے ہیں، بلکہ ان کا انحصار اس ذہنی ڈھانچہ پر ہوتا ہے، جو ان کوائف سے معرض وجود میں آتا ہے۔ نیز اس ردّعمل پر جو اس مذہب کی تعلیمات پر اس ذہنی ڈھانچہ کا ہوتا ہے۔ مشرق کی مطلق العنانی اور زندگی کے متعلق عوام الناس کے منفیانہ رجحان نے جسے مطلق العنان فرماں رواؤں کی حکم رانی نے بے حس اور خستہ حال بنا دیا تھا۔ اسلام پر اس مُلّایانہ ذہنیت کو مسلط کر دیا ہے جو آج بھی بڑی نمایاں نظر آتی ہے۔ اسلام میں کوئی منظم کلیسائی نظام یا مذہبی طبقہ نہیں لیکن اپنے مذہب کے عقائد کے متعلق جمہور مسلمانوں کا ردِ عمل ایک متحدہ فوج کی طرح ہوتا ہے۔ جو اپنے مذہب کی حفاظت کے لئے ہر وقت تیار رہی ہے۔ تحریکِ خلافت (۲۲-۱۹۲۱ء) کے بعد ہندوستان میں عام قتل عام نیز بڑے وسیع پیمانے پر ہجرت، اور ترکی میں آرمینیوں کا قتل۔ یہ ایسے مظاہر ہیں، جنہیں اسلام کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو یہ اسلام کے قطعی طور پر خلاف ہیں لیکن بہر حال یہ نتیجہ ہیں جاہل گم کردہ راہ عوام کے جنون کا۔ یورپ میں غلطی

سے اسلام کو تلوار کا مذہب مانا جاتا ہے۔ اور خود مسلمان بھی بڑے فخر سے فوجی فتوحات کو اپنے مذہب کی سربلندی کے حق میں بطور ایک ثبوت کے تسلیم کرتے ہیں۔ گو وہ پُرامن تبلیغ اور تلقین و تفہیم کا اسلام کی تاریخ میں اتنا ہی اہم حصہ رہا ہے جتنا عیسائیت میں۔[1]

ایک نقطہ ایسا ہے جس میں ایک مسلمان آج کے ایک یورپی شخص سے بنیادی طور پر بہت اختلاف رکھتا ہے اور وہ یہ کہ مسلمان کی ذہنیت قرونِ وسطیٰ کے مخصوص دینیاتی ماحول میں محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ اس معاملہ میں قرونِ وسطیٰ کے عیسائیوں کی بھی من وعن یہی کیفیت تھی۔ صدیوں تک ذہن و فکر کی تمام دوسری سرگرمیوں سے محروم ہونے کی وجہ سے مسلمان اب صرف مذہب کے محدود دائرے میں عقلی تسکین۔ دماغی اطمینان اور اپنے لئے عزت و احترام پاتا ہے۔ جہاں ایک طرف یورپ کی شہری زندگی نے طرح طرح کی مصروفیتوں خوشیوں اور گوناگوں سرگرمیوں کی شکل میں لوگوں کے سامنے عمل کے لئے نئے سے نئے میدان پیدا کر رہے ہیں۔ وہاں دوسری طرف عام طور پر ایک زراعت پیشہ مسلمان کی ذہنی سرگرمی صرف اس پر مرتکز رہتی ہے جو وہ اور اس کے آباؤ اجداد صدیوں سے پڑھ رہے اور اس پر عمل کر رہے ہیں۔ جس طرح ایک دیہاتی یا صوبائی آدمی کی

---

[1] جمعہ کی نماز میں امام منبر پر تلوار ہاتھ میں لے کر خطبہ دیتا ہے اور یہ دستور ان تمام ملکوں میں ہے جو اسلام نے تلوار کے زور سے فتح کئے۔

دلچسپیوں کا دائرہ ایک مرکزی شہر میں رہنے والے کے مقابلہ میں محدود ہوتا ہے۔ اسی طرح اسلامی مشرق کی سوچ بچار دنیا کے بڑے فکری دھاروں سے ہٹ کر صرف دینیاتی میدان میں گھر کر رہ گئی ہے۔

آج کل جامعہ ازہر کی درس گاہ کا سرکاری مجلہ متقل طور پر ایسے فتوے شائع کرتا رہتا ہے۔ جن میں فتویٰ پوچھنے والوں کو بتایا جاتا ہے کہ آیا فلاں دوائی کا استعمال یا فلاں صنعتی کام کرنا یا فلاں فیشن کا لباس پہننا، یا کوئی خاص کتاب پڑھنا شریعت اسلامی کی رُو سے جائز ہے یا نہیں۔ بات یہ ہے کہ اسلامی قانون زندگی کے ہر پہلو پر حاوی سمجھا جاتا ہے اور وہ بڑی سختی سے پوری انسانی زندگی کو ضابطے میں ڈھالتا ہے۔ لیکن ہم اسلام کو بحیثیت ایک مذہب کے اس کا ذمہ دار قرار نہیں دے سکتے۔ اسلام کا قرونِ وسطیٰ کے تاریک زمانے میں یہ بہت بڑا تہذیبی کارنامہ تھا کہ اس نے اس زمانے میں ان جاہل اور غلط کار انسانوں کو زندگی میں رہنمائی کے لیے ایک باقاعدہ نظام دیا جو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ نہایا کیسے جاتا ہے اور معقول طریقے سے خاندانی زندگی کیسے گذاری جاتی ہے، اور جن کے یہاں انصاف محض وحشیانہ طاقت پر منحصر تھا اور جن کی تہذیب عبارت تھی دُور از کار رفتہ توہمات سے۔ البتہ آج ہم ان لوگوں سے محاسبہ کر سکتے ہیں، جو محض اپنی پیشہ ورانہ اغراض کے لئے اس بیسویں صدی میں اپنے ساتھی

انسانوں کو دسویں صدی کے وسائل اور حالات کے مطابق چلانا چاہتے ہیں۔ اور جو اس حقیقتِ واقعی کا اعتراف کرنے کے لیئے تیار نہیں کہ مذہبِ اسلام انسانوں کے لیئے ہے اور یہ محض زبانی خدمت کی غرض سے وجود میں نہیں آیا۔ مشرق میں جامد اور فرسودہ ذہنیت نے اسلام کا صحیح ارتقاء روک رکھا ہے۔ اور مسلمانوں کا یہ شیوہ ہو گیا ہے کہ اگر کوئی شخص اسلامی قانون کے بعض حصوں کی خلاف ورزی کرے تو ان کی نظر میں گویا وہ پورے اسلامی قانون کا انکار کرتا ہے۔

اسلام کے مشہور بزرگ امام غزالیؒ نے جو صرف اپنے زمانے ہی کے دور رس اور حقیقت بیں مفکر نہ تھے۔ اور جن کی کہ ذہانت کی شمع گھری تاریکیوں میں ضوفشاں رہی ہے، عقیدے اور واقعیت میں مکمل ہم آہنگی پیدا کی۔ آپ کا مذہب کا تصور خالص اخلاقی تقاضوں کا اساس ناقابلِ انکار اجتماعی حقائق پر ہوتا ہے۔

مشرق، جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، قرونِ وسطیٰ کے بعد اقتصادیات میں ایک کمتر درجے پر دھکیل دیا گیا ہے اُس کی اِس اقتصادی پستی سے بہت سے نقصان دہ نتائج برآمد ہوئے۔ چنانچہ اسلامی مشرق بتدریج سمٹنے والے اقتصادی دائرے میں محدود ہو کر رہ گیا۔ اور اس سے اُسے جو نقصانات ہوئے وہ مشرقی اقوام کی روحانی اور سیاسی زندگی میں بہت جلد ہی نمایاں طور پہ نظر آنے لگے۔ اقتصادی اعتبار سے اِس طرح محدود ہو جانے کا سیاسی لحاظ سے یہ نتیجہ نکلا

کہ ان کے ہاں ڈکٹیٹری کا اصول غالب آگیا، جو خود اپنی بنائی ہوئی زنجیروں سے اپنے آپ کو آزاد کرا کے ایک وسیع انسانی تصور نہ بن سکا کہ ساری آباد دنیا کو اپنے احاطہ میں لے سکتا۔ چنانچہ یہاں یورپ بغیر کسی بندش کے آزادانہ تصورات کی طرف بڑھتا رہا اور اس نے اپنے مادی اور روحانی ذخائر کو دور دراز ملکوں اور ان کی تہذیبوں کے خزانوں سے مالا مال کیا۔ وہاں مشرق اس قسم کے میل جول اور اس سے حاصل ہونے والی برکات سے کلیتہً محروم تھا۔ آزادانہ نشر و اشاعت سے محروم ہونے کی وجہ سے اسلامی تہذیب جامد ہوتی چلی گئی۔ بہت ممکن ہے کہ انسانی ذہن کا اسلامی عقائد کے معاملہ میں کسی دوسری آب و ہوا اور کسی دوسرے جغرافیائی ماحول میں اس سے بالکل مختلف ردّ عمل ہوتا۔ آخر آج کی یورپی جدید ذہنیت مسیحی عقائد کی تشریح و تفسیر قرونِ وسطیٰ سے بالکل مختلف طریقہ سے کرتی ہے۔ اور نقطۂ نظر کی اسی تبدیلی سے علوم و فنون کے ہر شعبے میں مسیحی یورپ نے اس قدر ترقی کی ہے۔ چنانچہ کرۂ ارض کے گمنام ترین حصوں تک میں یورپ والوں کی فتوحات نے ان کے دماغوں کو مالا مال کر کے انہیں اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو ترقی دے سکیں۔ ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کی فتوحات اسپین پر نہ رُک جاتیں اور ان کا دائرہ اثر وسط یورپ تک وسیع ہو جاتا تو مشہور مورخ گبن کے الفاظ صحیح ثابت ہوتے۔ اور آج برطانیہ کی

ادبی زبان عربی ہوتی ۔ اور شائد یورپ کی نشاۃ ثانیہ دو منطقوں یعنی لاطینی مسیحی منطقے اور عربی مسلم منطقے کے کلچر ہی سے وجود میں آتی ۔ لیکن ہوا یہ کہ جب نشاۃ ثانیہ کا ظہور ہوا تو اس وقت یورپ سے اسلام ختم ہو چکا تھا ۔ اسپین کی چھوٹی چھوٹی اسلامی ریاستیں صدیوں تک ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما رہ کر مسیحی اسپین کے مقابلہ کے لیے ایک متحدہ سیاسی محاذ بنانے میں ناکام رہیں ، اور اسپین کے عیسائیوں نے موقعہ پاتے ہی زبردست یورپی قومی شعور سے سرشار ہو کر بہت منظم طریقہ سے ان پر حملہ کر دیا ۔ جب اسپینی مسلمان نرغے میں آگئے تو اسلامی دنیا نے ان کی مطلق پروانہ کی بلکہ بعض اسلامی سلطنتوں کو ایک گونہ مسرت ہوئی کہ انہیں اپنے رقیبوں سے نجات مل گئی ۔ عین اسی زمانہ میں ادھر مشرق میں عثمانی ترکوں نے بڑے بڑے علاقے فتح کیے ۔ لیکن ان فتوحات نے بلقان سے بازنطینی کلچر کو تو ختم کر دیا ۔ لیکن اس کی جگہ کسی دوسری موثر اقتصادی اور روحانی زندگی کو پیدا نہ کیا ۔ عثمانی فتوحات ایک سیلاب تھا ۔ لیکن ایسا سیلاب جو زمینوں کو زرخیز نہ کر سکا ۔

یورپ میں مذہبی اصلاحات کی جنگوں نے وہاں قومیت کے جذبے کو پیدا کیا ، جس کی وجہ سے یورپ میں قومی ریاستیں وجود میں آئیں ۔ اس کے برعکس دنیائے اسلام کا ڈھانچہ اسی دینیاتی رُوح کا سختی سے پابند رہا جو ایک وسیع اجتماعی اور معاشی نظام میں عوام الناس کی بڑی

تعداد کو ساتھ لینے کے نا اہل تھی۔ مشرق میں عوام الناس نے بغیر کسی تبدیلی کے صدیوں پہلے کی زندگی کو جاری رکھا اور ان کے ہاں کوئی نئے تصورات پیدا نہ ہو سکے۔ ہماری وسیع دنیا سے بے تعلق ہونے کی وجہ سے ان میں ایک عام جمود آ گیا۔ مثال کے طور پر مصر میں عثمانی ترکوں کے قبضہ سے لے کر فرانسیسی حملے تک لوگوں کی کوئی تاریخ نہ تھی۔ مصر کے وزیر اعظم نوبار پاشا نے اہل مصر کی تاریخ لکھوانے کی کوشش کی لیکن اس کے مورخین کو مصر کے ارتقاء یا اس کی ترقی کے متعلق سن وار تاریخیں نہ مل سکیں۔ مصر کی اس طویل عرصے کی تاریخ محض ایک حکمرانوں کے آئے دن کے جھگڑوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور یہی چیز آپ کو شام اور عراق میں بھی ملے گی۔ لیکن جب مشرق میں عوام الناس حکمرانوں کی شخصی اغراض کے کھلونے بنے ہوئے تھے عین اس وقت یورپ میں عظیم شخصیتیں اپنی اپنی قوموں کی صلاحیتوں اور روحانی بیداری کو زبردست قومی ریاستیں بنانے میں صرف کر رہی تھیں۔

لوگوں کی زندگی پر تاریخی اسباب اکیلے اثر انداز نہیں ہوا کرتے بلکہ ان میں سے ایک کا دوسرے پر بڑا گہرا ردعمل ہوتا ہے دنیا کی تجارتی آمدورفت کے اقتصادی محور کا بحیرہ روم کی جگہ بحر اوقیانوس میں بدلنا تھا کہ اس نے مشرقی اقوام کو صرف خام اجناس پیدا کرنے والے نوآبادکاروں کے درجہ پر گرا دیا اور ان کی زمانے سے پیچھے رہ جانے والی ذہنیت اور جامد اجتماعی نظام نے انہیں اس قابل

نہ رکھا کہ وہ اپنے آپ کو اس زبوں حالت سے نکال سکیں۔ اس امر کا جاننا بڑا دلچسپ ہوگا کہ اس دور میں بڑے آدمی کا تصور، جو تاریخ میں اور بالخصوص کم درجے کے منظم معاشروں میں غیر معمولی کردار پیش کرتا ہے یوں کہیئے اسلام سے غائب ہی ہو گیا۔ البتہ ہندوستان کے چھ مغل فرماں رواؤں کو آپ وقتی طور پر اس سے مستثنیٰ قرار دے سکتے ہیں۔ بعض مؤرخین اس کا سبب ان ملکوں کا منطقہ حارہ میں واقع ہونا قرار دیتے ہیں۔ جو پچھلے پانچ سو سال میں ایک بھی نئے سیر حاصل تصور کو پیش کرنے پر فخر نہیں کر سکتے۔ ترکی نے سلیمان اعظم جیسے فاتح پیدا کیے جس کی صلاحیتوں کا اظہار فوجی عظمت اور قابلِ تعریف نظم و نسق حکومت میں ہوا۔ بے شک اُس وقت کے آپس میں بٹے ہوئے یورپ کی صورتِ حال نے بھی جو ان دنوں مذہبی اصلاحات کی جنگوں میں پھنسا ہوا تھا، سلیمانِ اعظم کی سیاسی کامرانیوں میں بڑی مدد دی لیکن جہاں تک کلچر اور تہذیب کا تعلق ہے، عثمانی ترکوں کی حکومت دنیا کو ایک قدم بھی آگے نہ لے جا سکی۔ اور نہ اس نے ترکوں کو اس ضمن میں کوئی خاص فائدہ پہنچایا۔ عثمانیوں کی وسیع سلطنت کو مسلسل فتوحات سے آنے والے مالِ غنیمت اور محکوم ملکوں کے بے ڈھنگے استحصال نے یکجا اور متحد رکھا، ان کی سلطنت کا واحد اساس صرف حکمران کی شخصیت تھی، جب کہ اسی زمانے میں یورپ میں معاشی تغیرات اور ان سے حاصل ہونے والے روز افزوں نفع نے متوسط طبقوں

کی آسودگی کی بنیادیں مضبوط کرنی شروع کر دی تھیں۔ اگر ہم تاریخی واقعات کے تسلسل کو اس زمانے میں دیکھیں تو یوں نظر آتا ہے کہ مشرق کے عظیم ترین حکمرانوں کا وجود میں آنا وہاں کے لوگوں کی زندگی میں صرف ایک حادثے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اکبرِ اعظم نے ہندوستان میں عیسائیت ہندو مذہب اور اسلام کو متحد کر کے ایک کُل ہند عقائد کی وحدت اور ہم آہنگی پیدا کرنے اور ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھنے کی کوشش کی۔ وہ ہندوستان کا سب سے بڑا مسلمان فرماں روا تھا گو وہ پڑھ لکھ نہ سکتا تھا لیکن ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ علمی صلاحیت کے ہرگز یہ معنی نہیں ہوتے کہ ان کا حامل حکومت کرنے کی بھی اعلیٰ صلاحیت رکھتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، سلطنتِ عثمانیہ کے بانی عثمان، اکبر اور جدید مصر کے مؤسس محمد علی سب کے سب ان پڑھ تھے۔ نظری علم زندگی کے بعض امور میں ایک حد تک رکاوٹ بھی ثابت ہوتا ہے، بالخصوص جہاں ایک فیصلہ کن عملی اقدام کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسلامی ادب

مشرقی روح کی سستی اور بے دلی، جو قرونِ وسطیٰ کے اختتام کے ساتھ ہی شروع ہو گئی تھی، اس کا سب سے واضح اور نمایاں اظہار مشرقی زبانوں کے طریق نشو و نما میں ہوتا ہے عربی زبان جسے اسلامی تہذیب اور کلچر کا حامل ہونا تھا وہ اب تک قدیم طرز کے سامی محاورات کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکی۔ بے شک اس نے یورپی زبانوں کو بہت سے الفاظ دیئے، جو اب بھی استعمال ہوتے ہیں شروع شروع میں جب عربوں کے ہاں سائنٹفک علوم اور علم لغت میں بڑی سرعت سے ترقی ہوئی، تو اس کی وجہ سے عربی زبان کا دائرہ بھی وسیع ہو گیا۔ لیکن بعد میں جب مسلمانوں میں روحانی جمود آ گیا تو عربی زبان میں سائنٹفک افکار کی جگہ زبان کے متعلق بے کار قسم کی موشگافیوں نے لے لی۔ اس تعلیم و تربیت کے طریقے نے عربوں کو حفظ کرنے اور رٹنے کی عادت ڈال دی اور اس کی وجہ

سے ان میں آزادانہ طور پر سوچنے کا ملکہ جاتا رہا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں سائنس کی ترقی، جس کی بنیاد مشاہدے اور تجربہ پر تھی ان کے ہاں رک گئی۔ لیکن علم لسان کو جس کا تمام تر انحصار بے رُوح حواشی کی کتابوں پر تھا، عربی دنیا میں خوب فروغ ہوا۔ عربی علم لسان کا مطالعہ اس لئے خاص طور سے دلچسپی کا مرکز رہا، کیونکہ اہل علم کے لئے اس وقت علوم کی دوسری شاخوں میں کوئی کشش نہ رہی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے اُن کی یہ دلچسپی محض ایک مردہ چیز کو سمجھنے کے لئے تھی اور اس نے نہ کسی نئی ادبی تخلیق کی نشو و نما میں مدد کی، اور نہ اس کی حوصلہ افزائی ہی کی۔

اسلامی ادب ایک خاص تعلیم یافتہ طبقہ کی، جو عوام سے الگ تھلگ تھا، جاگیر بن کر رہ گیا۔ اس ادب کو سمجھنے کے لئے پڑھے لکھوں کو شرحوں اور حواشی کی ضرورت پڑتی تھی جن کے بغیر ایک عام قاری مختلف مقامات کی طرف اشاروں اور نامانوس الفاظ کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہتا تھا۔ ایک عرب کو اپنا کلاسیکی ادب پڑھنے میں تقریباً وہی دقت ہوتی ہے، جس سے ایک اجنبی کو جو کتابوں سے عربی زبان سیکھتا ہے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مشرقی ذہن ایک ادبی شاہ پارے کے پوشیدہ حسن سے محظوظ ہوتا ہے اور اس کے ہاں نظم سے یہ محاسن صرف اِسی صورت میں اجاگر ہو سکتے ہیں، جب اس کے معانی میں بار بار غور و خوض کیا جائے۔ علم اور ادبی لذت

ایک پایہ قاری کو اپنے آپ میسر نہیں آسکتی - بلکہ اسے زمین کے نہاں خانوں سے قیمتی پتھروں کی طرح ڈھونڈنا پڑتا ہے - چنانچہ اسلامی زبانیں اس قسم کے شوق کی تسکین کا اپنے اندر پورا سامان رکھتی ہیں۔

غیر عرب مسلمان اقوام کو قرآن کی الہامی زبان نے اس حد تک شیفتہ کیا کہ انہوں نے اپنی زبانوں کے بنیادی الفاظ کو نکال کر ان کی جگہ عربی الفاظ لے لئے اور اس طرح انہیں مکمل طور پر عربی رنگ میں رنگ دیا۔ اس معاملہ میں ایرانی سب سے پیش پیش تھے۔ اور وہ اس لئے کہ انہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا تھا۔ اس کے بعد ترک آتے ہیں اور ترکوں کے بعد ہندوستان کے مسلمان فاتح ہیں جنہوں نے اپنی زبان میں عربی اور فارسی الفاظ کی بھرمار کر دی -

ترکی ادب نے مشہور فارسی اساتذہ کا بڑے غلامانہ انداز میں تتبع کیا اور اس طرح ترکی ادیبوں نے اپنی زبان کو فارسی الفاظ سے بھر لیا - اس ضمن میں ترکی نظم تو معقول حدود کے اندر رہی کیونکہ صنف نظم کے لئے بعض الفاظ مخصوص تھے - جن کا کہ استعمال ضروری تھا لیکن نثر کے لئے اس طرح کی کوئی پابندی نہ تھی - چنانچہ وہ بہت جلد بے معنی الفاظ کا طومار بن گئی - اسی طرح اردو زبان میں بھی مخلوط محاورے داخل ہو گئے، اور اہل علم کے لئے ضروری ہو گیا کہ وہ لکھتے وقت مخصوص مسلمہ نمونوں کا تتبع کریں - اور نثر اتنی مرصع اور مسجع ہو گئی کہ بعض اوقات اس کی دس پندرہ سطروں میں ہمیں بمشکل صرف ایک قابل

فہم فقرہ ملتا ہے۔ اس عجیب قسم کے طرزِ تحریر نے ہندوستانی مسلمانوں کے ادبی مذاق کو بتدریج خراب کر دیا۔ اور وہ نہ سمجھ میں آنے والی لفاظی اور عبارت آرائی میں پھنس کر رہ گئے۔ سترھویں اور اٹھارہویں صدی نے جہاں ایک طرف یورپ میں مغرب کی تقریباً ہر زبان میں ادبی شاہ کاروں کو جنم دیا، وہاں مشرق بالکل جمود کی گہری دلدل میں جا گرا اور ان صدیوں میں اس کے ہاں ایک بھی قابلِ ذکر ادبی پارہ وجود میں نہیں آیا۔ مشرقی اقوام مغرب کی زبردست تہذیبی ترقی سے قطعاً بے خبر تھیں۔ جب کہ مغربی علماء نے مشرق کی روحانی قدروں پر روشنی ڈالنی شروع کی اور تراجم کے ذریعہ انہیں عام کرنے لگے۔ مشرق میں عوام کی ایک بہت بڑی تعداد ان پڑھ تھی، اس لئے وہ تعلیم یافتہ طبقہ کی مخلوط زبان کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ فارسی، اردو یا ترکی ادبی کتاب کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ مقامی باشندہ اس قسم کی تعلیم حاصل کرے، جیسا کہ عام طور پر ایک یونیورسٹی میں حاصل کی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک عرب کو بھی جو اپنی قوم کے ادب سے محظوظ ہونا چاہتا ہے۔ زبان اور صرف و نحو کا کافی مدت تک مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ عربی دنیا کے ایک بڑے حصے میں لوگ مختلف اقسام کی مقامی بولیاں بولتے ہیں، جن میں سے بعض کلاسیکی ادبی زبان سے کافی مختلف ہیں۔ عربی بولنے والے ملکوں میں قرونِ وسطیٰ کے خاتمے سے حکمران طبقے نسل اور جذبات دونوں اعتبار سے اجنبی رہے ہیں اور انہوں نے ان ملکوں کے عوام کو عمداً جاہل

رہنے دیا۔ سلطنت عثمانیہ میں ینی چری غیر مسلم والدین کے بچوں کو اغوا کر لیا کرتے اور جب وہ بڑے ہوتے تو ان سے سلطنت کے نظم و نسق اور افواج کے اعلیٰ عہدے پُر کئے جاتے۔ مصر میں کاکیشیا اور ترکستان کے مملوک مقامی غلامین پر حکومت کرتے تھے، ایران میں تاتاریوں کے ہاتھ میں عصائے حکومت تھا۔ یہ حکمران طبقے تہذیب اور زبان دونوں لحاظ سے اپنے آپ کو عوام سے بالاتر رکھتے تھے۔ ترکی زبان ایک مخلوط مصنوعی زبان بن گئی تھی۔ اور بعض ادوار میں تو وہ بیزار کن لفاظی بن کر رہ گئی۔ مصر اور شام میں کلاسیکی عربی زبان اپنے بلند معیار سے گر کر پسے ہوئے ستم رسیدہ مزارعوں کی غیر مہذب زبان کے درجے پر پہنچ گئی۔ صرف مصر کی ایک جامعہ ازہر تھی جہاں کلاسیکی عربی زبان کی نشو و نما جاری رہی۔ لیکن حکمران طبقے وہاں بھی ترکی بولتے تھے۔ جامعہ ازہر کے شیوخ نے اپنی توجہ مذہبی کتابوں کے خلاصے حواشی اور طرز قدیم پر کچھ نظمیں لکھنے تک محدود رکھی۔ اور اس طرح عربی ادب کا صرف تسلسل ہی جاتا نہ رہا بلکہ اس کی قدیم اور نادر کتابیں بھی ناپید ہو گئیں۔ اور انہیں بھلا دیا گیا۔ کسی نے عوامی ادب کی پروا نہ کی، اور یہ ادب غریب اور عیاش طبقوں کا سرمایہ تفریح بن کر رہ گیا۔ اور اس دوران میں پیشہ ور ادبا نے حکمران اور امیر طبقوں کی خاطر جو کچھ لکھا، اسے کسی طرح بھی ادب یا علم کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

مشرق میں معاشرہ دو صنفوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک صنف چند امیر اور پڑھے لکھوں کی اور دوسری صنف بے شمار غریبوں اور جاہلوں کی تھی۔ اس تقسیم کی عدم مساوات اس بنا پر اور بھی زیادہ ہو گئی، کہ اوپر کے طبقہ کو جو تعلیم دی گئی وہ تمام کی تمام یک طرفہ، ناقابلِ عمل اور وقت کے غیر مطابق تھی۔ بہر حال اس کے ساتھ ہی یہاں اس بات کا ذکر کر دینا مناسب ہوگا کہ معاشرہ کی اس تقسیم نے اوپر کے طبقہ کی بعض شریفانہ خصائص کو جو اسلامی روایات کا ماحصل تھیں، ختم نہیں ہونے دیا۔ جیسے مہمان نوازی، اجنبیوں کے ساتھ اسراف کی حد تک فیاضی، شستہ اور باسلیقہ آداب جن کا یورپ کے درباروں کے آداب سے مقابلہ کیا جا سکتا تھا۔

وہ معنوی اسباب جو عام طور پر اسلامی علوم کے جمود کا باعث بنے ان میں سے ایک سبب عربی رسم الخط ہے، جسے سب مسلمانوں نے بغیر اس کا خیال کئے کہ آیا وہ ان کی زبان کے لئے مناسب بھی ہے یا نہیں، اختیار کر لیا ہے۔ عربی رسم الخط میں اپنی تمام آرائشی خوبصورتیوں کے باوجود بہت سی کوتاہیاں ہیں، جو غیر سامی الفاظ کے لکھنے میں بُری طرح رکاوٹ بنتی ہیں۔ اس میں حروفِ علت کا بڑی مشکل سے اظہار ہوتا ہے اور اس کا زیادہ زور حروفِ صحیح پر ہوتا ہے، جن کے نازک ترین اجزاء کو وہ بڑی تفصیل سے نمایاں کرتا ہے، یہ رسم الخط عربی زبان کے اظہار کے لئے بہت مناسب واقع ہوا ہے۔ اس میں

سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ اس کو سیکھنے کے لئے لاطینی رسم الخط کے مقابلہ میں جس میں حروف الگ الگ لکھے جاتے ہیں اور جس میں ہر حرف کی اپنی مستقل صوتی حیثیت ہوتی ہے، بہت زیادہ وقت صرف ہوتا ہے۔ لاطینی رسم الخط آسانی سے پڑھا جا سکتا تھا۔ اور وہ ٹائپ کے لئے موزوں بھی تھا۔ اس کے علاوہ ایک تو اس میں چھپی ہوئی کتابیں کم قیمت تھیں، اور دوسرے یورپ میں چونکہ عوامی محاورے ادبی معیار بن گئے تھے۔ اس لئے ان چیزوں نے یورپ میں پڑھنے والوں کی تعداد میں بہت اضافہ کر دیا، بمقابلہ مشرق کے جہاں کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں اور اس لئے بہت کم یاب اور مہنگی تھیں۔ اور ان کا اسلوب بھی کلاسیکی تھا۔ یورپ میں ادب کا طباعت کی صنعت کے ساتھ بہت گہرا رشتہ قائم ہو گیا۔ اور ادب کے مقامی قومی زبانوں میں ہونے کی وجہ سے عوام الناس میں اس کی بڑی سرعت سے نشر و اشاعت ہونے لگی۔ عمومی تہذیب اور اس کے پھیلاؤ میں طباعت کی ایجاد اور اس کے دستی طریقہ تحریر پر ٹیکنیکل لحاظ سے اعلیٰ ہونے کا بہت زیادہ حصہ ہے۔ بے شک یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ لیتھو کی چھپائی نسبتاً سستی ہے۔ کیونکہ اس میں ردّی سے ردّی قسم کا کاغذ بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن لیتھو سے عوام میں نوشت و خواند کو عام نہیں کیا جا سکتا اور وہ اس لئے کہ اس کے حروف بہت پیچیدہ ہوتے ہیں۔ بہر حال لیتھو کی چھپائی اس گراں قسم

کی چھپائی کی قائم مقام ضرور ہو سکتی ہے جو انیسویں صدی اور اس کے بعد ہندوستان میں رائج تھی۔ الغرض جیسے جیسے طباعت کی صنعت بڑھتی چلی گئی اور اس کے ساتھ اس کی وجہ سے مغرب کی روحانی زندگی بھی جمہوری بنتی گئی ویسے ویسے قومیت کی رُوح نے مغربی ادب میں ایک زیادہ سیر حاصل، زیادہ آزاد اور متنوع ہئیت کی تخلیق کی۔

نشاۃ ثانیہ کے ساتھ ساتھ یورپ میں رُوحانی بیداری کے آزادی سے پھیلنے کا دور شروع ہوا اور یہ چیز انسانیت کے وسیع تصور کو بر سر کار لانے کا باعث بنی اور اس نے روایات پرستی کی تنگ حدود کو توڑ کر رکھ دیا۔ علم سائنس اور فن کی نئی زندگی شروع ہوئی اور انہوں نے اس طرح ترقی کی کہ اس سے پہلے اس کی کوئی مثال نہیں مل سکی۔ وہ سرچشمے جن سے انہوں نے اپنی نئی زندگی کے لئے قوت اخذ کی وہ یونان کی کلاسیکی قدامت کے معیاری نمونے تھے جو مذہبی رُوح کی بھٹی میں پڑ کر اور بھی پاکیزہ ہو گئے تھے اس طرح حُسن اور خیر کی یکجائی عمل میں آئی۔ اور ان دونوں نے مل کر انسانی رُوح کو رسُوم پرستی کی زنجیروں سے آزاد کرنے کی ٹھانی۔

جب مغرب میں یہ تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں، اسلامی مشرق جمود کی گہری نیند میں سویا ہوا تھا۔ اور وہاں کے اہل قلم اور مفکرین اس کے لئے تیار نہ تھے کہ وہ اپنی علمی سرگرمیوں میں اپنی شخصیت

اور فطرت کے ساتھ اپنے رشتہ کی وضاحت کرنے کی کوشش کریں۔ بلکہ ان کے پیش نظر اپنے خیالات کو بلکہ سچ پوچھئے تو اپنے متقدمین کے خیالات کو ایک ایسے طریقہ سے پیش کرنا تھا جس کے اردگرد قدیم روایات نے تقدس کا ہالہ بنا دیا تھا۔ ان کے ہاں علم سائنس اور فن کا معیار حقیقی حُسن نہیں، بلکہ وہ حُسن تھا جسے سب لوگ حُسن کہیں، دورِ جدید کی ابتدا ہی سے مشرقی دماغوں کا یہ نصب العین بن گیا تھا کہ وہ ایک ہی مضمون کو سنسنی پیدا کرنے اور حتی الوسع پیچیدہ انداز میں ہمیشہ پیش کرتے رہیں۔ مشرقی ادب ایک ہی طرح کے پیش پا افتادہ مضامین سے بھر گیا۔ مثلاً ہزارہا فارسی اور ترکی شاعروں کے قلم میں سے ایک ہی طرح پروانہ اڑ کر شمع کی طرف جاتا تاکہ وہاں اپنے محبوب کے قدموں میں جان دے۔ پچھلے ایک ہزار سال سے عربوں کے ہاں نظم کی ایک ہی صنف یعنی قصیدہ مقبول چلا آتا ہے جس میں کہیں طول کلامی ہوتی ہے کہیں مختصر سی منظر نگاری اور بعض اوقات پُرشکوہ ترکیبیں اور خال خال کبھی ایک آدھ اچھے خیال کی ضوفشانی ملتی ہے۔ اہل یورپ کو مشرق کی غزلیہ شاعری میں شاذ و نادر ہی سب سے اہم مواد یعنی شاعر کے شخصی جذبات ملتے ہیں۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ شاعری تو صرف دنیا بھر کے زخمی دلوں کی آرزوؤں کی ترجمانی کرتی ہے

ہم نے مشرق اور مغرب کے اختلافات کے بارے میں عام طور پر جو کچھ اوپر کہا ہے وہ ادب پر بھی پورا اترتا ہے۔

یورپی رُوح بتدریج شخصی خطوط پر بڑھتی چلی گئی، لیکن مشرق بے
حس وحرکت انہی دائروں میں کھڑا رہا ۔ اس کی برابر یہ کوشش رہی
کہ جو ادبی قدریں پہلے سے موجود ہیں ان کو اور زیادہ سمجھے اور مزید
تفصیل سے ان کو بیان کرے اور اس کی برابر یہ خواہش تھی کہ ان میں
اور زیادہ ضم ہو جاتے ۔ مشرق کے نزدیک تاریخ کے معنی ایک
ایسی چیز کے تھے جو مکمل ہو چکی اور جو مقدر شدہ ہے ۔ اور مغرب
کے نزدیک تاریخ بار بار نئی قوت حاصل کرتی ہے اور ایک مستقل
ارتقائی عمل ہے ۔ مشرقی ذہن نمایاں طور پر مذہبی واقع ہوا ہے
اور وہ وحی والہام کو ایک ابدی اور ناقابل تغیر قانون سمجھتا ہے ۔
لیکن ایک یورپی اس کو ایک رمزی اور اشاراتی تعلیم (symbols)
مانتا ہے ۔

اخلاقی انتشار

مشرق کے جمود اور اس کے زوال کی اس وقت تک پوری تشریح نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے اخلاقی شعور کے فقدان کا ذکر نہ ہو۔ اخلاق ـــ ہمارا اس سے مقصد صرف جنسیات نہیں اور نہ اس لفظ کو ہم محض جنسیات تک محدود کرنا چاہتے ہیں۔ تاریخ میں ایک اہم حیثیت رکھتے ہیں، اور جن کی اہمیت کو بالعموم کم سمجھا جاتا ہے۔ اغراض پرستی اور ایک فعل کے اخلاقی ردِ عمل سے بے پروائی یہ چیز محض اخلاق کے خالص مجرد اصولوں کے اعتبار سے مضرت رساں نہیں۔ بلکہ اس سے قوم میں ایک عام بے اعتمادی کی فضا پیدا ہو جاتی ہے جو معاشرہ کی سب سے مفید اور بار آور قوتوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ اور اس کی جگہ بہت ہی نقصان دہ قسم کی قوتیں بروئے کار آ جاتی ہیں۔ اخلاقی ذمہ داری کا احساس، یہ یقین کہ بے انصافی، غداری جھوٹ، چند کے فائدے کے لئے آبادی کے ایک بڑے طبقہ کا معاشی

استحصال، مادی اعتبار سے قوم کو کمزور کر دیتا اور ان لوگوں کی آرزوؤں اور دیانت کو پامال کر دیتا ہے۔ جو ان برائیوں کا تختۂ مشق بنتے ہیں۔ جو لوگ ان بداخلاقیوں کا شکار ہوتے ہیں وہ اپنی قوت مدافعت کھو بیٹھتے ہیں اور وہ خود اپنے ماحول میں بھی وہی نازیبا حرکتیں کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں جو ان کے ساتھ ہو چکی ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ باہمی تعاون کے شعور کا فقدان اور اس یقین کا فقدان کہ معاشرے کی بنیاد اس اصول پر قائم ہے کہ اس کا ہر فرد دوسرے کے حقوق ادا کرے۔ قوم کو اس پہیے کی طرح بنا دیتا ہے جس کے گرد کا چکر ٹوٹ پھوٹ رہا ہو۔ اسکول کے کمروں کے اندر اخلاقیات کی تعلیم اور بڑے ہو کر سکول کے باہر کی زندگی میں اس تعلیم کے بالکل برخلاف عملی زندگی کا مشاہدہ، یہ چیز افراد کی اخلاقی منطق کے شیرازے کو پارہ پارہ کر دیتی اور ان میں ایک ایسا انتشار پیدا کرتی ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ حقیقی اخلاقی تعلیم عبارت ہے ضابطۂ قانون کی پابند زندگی، اس کے عملی تجربہ اور اس پر خود ٹھیک ٹھیک عمل کرنے سے۔

اسلامی مشرق میں رائج شدہ ظلم وجور اس کے عوام کے اخلاق کے لئے بدترین درس گاہ تھی۔ افراد کی خودغرضی اور نو دولتے یہ سرمایہ دار طبقے کی غیر ذمہ داری نے اسلامی معاشرے کے ڈھانچے کی بنیادوں کو کمزور کر دیا، یہاں تک کہ اس میں دیانت اور

ایمانداری کے معنی افلاس سمجھے جانے لگے اور جو شخص سچائی اور استقامت پہ گامزن ہونے کی جرأت کرتا، اسے اپنی قربانی کی صورت میں اس کی سزا بھگتنی پڑتی، بلکہ الٹا اس کی اس قربانی کا فائدہ بھی معاشرے کے غیر مستحق عناصر کو پہنچتا۔ حکومتوں نے رعایا کو مادی اور اخلاقی دونوں اعتبار سے لوٹنا کھسوٹنا اپنا شعار بنا لیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قوم کا متوسط طبقہ دوسروں کا فرماں بردار آلہ کار بن گیا، اور اس کا یہ کام ہو گیا کہ وہ حکمرانوں کی خوشامد اور ان کی حماقتوں پر داد دینے کے لئے ہمہ وقت آمادہ رہے، لیکن جہاں تک عوام الناس کی غالب اکثریت کا تعلق تھا وہ بدستور جاہل افلاس زدہ اور تباہ حال رہی۔ ان حالات سے مسلمان اقوام میں دو خصلتوں کو خاص طور پر نشو و نما دی۔ ایک یہ کہ ہر اس شخص کے لئے جو بھی برسر اقتدار آئے، جھوٹی خوشامد اور دوسری یہ کہ ہر نئی صورتِ حال کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لینا، یہاں تک کہ اس کی قدریں بے حسی اور مردہ دلی تک پہنچ گئیں۔ چند روزہ دنیاوی ثروت اور وہ بھی مشکوک ذرائع سے اکٹھی کی ہوئی، ہر من چلے اور جری طبیعت والے کو اپنی طرف کھینچنے لگی اسی لالچ میں ترکی، ہندوستان اور مصری ریاستدانوں نے بارہا اپنے حکمرانوں اور اپنے عوام کے مفادات کے ساتھ غداریاں کیں چنانچہ مشرق کے جنگی میدانوں میں یورپ کے سپہ سالاروں کو جو حیرت انگیز فتوحات ہوئیں وہ بہت حد تک انہی غداریوں کے طفیل تھیں۔

لیکن ہمیں اس جگہ قطعی طور پر اس دعوے کی تردید کر دینی چاہئے کہ مسلمانوں میں یہ اخلاقی ابتری اسلامی تعلیمات کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اسلام پاک دامنی اور دیانت داری کی جس پُر خلوص یقین کلّی کے ساتھ تعلیم دیتا ہے، اور اس نے اخلاقیات کا جس قدر بلند معیار رکھا ہے، اس کو جاننے کے بعد تو مسلمانوں کی بہت سی تاریخی شخصیتوں کا جنت الفردوس میں داخل ہونا مشکوک نظر آتا ہے۔ دراصل انسانوں کی ابلیسی فطرت نے آسمانی احکام کو اکثر اپنی ذاتی اغراض کا تابع بنا لیا ہے۔ اسی بنا پر اسلام کے بارے میں بھی یہ غلط تاثر پیدا ہو گیا کہ اس کا مذہبی نظام مسلمانوں کی اس اخلاقی ذلیل حالی کا ذمہ دار ہے۔

ہم آج یورپی ممالک میں بھی انسانی بداخلاقی کی یہی حالت دیکھتے ہیں اور وہاں بھی عیسائیت بڑے زور و شور سے اپنے اعلیٰ مقاصد کی تبلیغ کرتی رہتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کے ماننے والے اکثر لرزہ خیز اور شرمناک جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ ان جرائم کا ارتکاب کرتے وقت ان کی زبانوں پر مذہب کا نام ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا نتیجہ حتمی طور پر اجتماعی اور سیاسی انحطاط ہو گا۔

علاوہ ازیں مشرق میں سائنس اور اجتماعی نظام کے جمود اور اس کے ساتھ ساتھ اجتماعی شعور کی کمی نے متعدی امراض کے لئے کھلا میدان چھوڑ دیا اور انہوں نے مشرقی اقوام کو جسمانی لحاظ سے

بہت نقصان پہنچایا، نیز ان کی اخلاقی قوتِ مدافعت کو کمزور کر دیا۔ یاد رہے کہ آج کل مسلمانوں میں جو غلط قسم کی مشہورِ عام "تقدیر پرستی" اور بے حسی پائی جاتی ہے، اس کا سبب ان کے ہاں کی نااہل حکومتیں اور ملیریا کی کثرت ہے۔ نہ کہ اسلام کی تعلیمات۔ ان حالات میں عوام الناس کو مجبوراً دنیاوی زندگی سے ناامید ہو کر تصوف اور بے ہنگم قیاس آرائیوں میں پناہ لینی پڑی۔ منافقت اور ریاکاری کو فروغ ہوا، اور اس نے معاشرے کو اپنا غلام بنا لیا، اور مستبد حکومتوں کے ہاتھوں تباہی سے بچنے کا اس کے سوا اور کوئی ذریعہ بھی نہ رہا تھا۔ بداخلاقی، خود غرضی، غلط قسم کی تعلیم اور اس سے پیدا ہونے والے تباہ کن نتائج نے نہ صرف اس دور کی رُوح کو کچل دیا، بلکہ ان سے مترتب ہونے والے اثرات بعد میں آنے والی نسلوں میں بھی سرایت کر گئے۔ اور اس طرح انہوں نے پوری کی پوری قوم کی روح اور اس کی اخلاقی صلاحیتوں کو تباہ کر کے رکھ دیا۔۔ یہی وجہ ہے کہ وہی اقوام جنہوں نے پہلے زمانے میں بڑے بڑے شاندار کارنامے سرانجام دیئے تھے، کمزور ہو کر ختم ہو گئیں اور ان کے مقابلے میں جو دوسری قومیں تھیں، ان کو جب اچھی اور سچی تربیت نصیب ہوئی تو ان کی حالت سدھر گئی اور وہ شاہراہ ترقی پر گامزن ہو گئیں۔ قوموں کی تعلیم یہاں تعلیم سے مراد اس کا حقیقی مفہوم ہے، واقعہ یہ ہے کہ تاریخ کے سب سے مؤثر عناصر میں سے

ایک اہم عنصر ہے۔

اب جہاں تک اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کا تعلق ہے، صحیح یہ ہے کہ مسلمان ملکوں کے اکثر حکمرانوں نے ان پر عمل نہیں کیا اور جو مذہبی رجحان رکھنے والے مسلمان تھے وہ حکمرانوں کی روحانی اور معاشی لوٹ کھسوٹ سے دل برداشتہ ہو کر دنیا سے منہ موڑ بیٹھے، اور عمر خیام کی طرح بہت سے صوفی شاعر دنیا دی زندگی کی ناپائیداری کے راگ الاپنے لگے۔ مذہب کے اعلیٰ مدارج اور تصوف کی بدولت تسلیم و رضا کی جو نعمت میسر ہوتی ہے، ممکن ہے اس سے چند منتخب افراد کو سکون و طمانیت مل گئی ہو۔ لیکن اس چیز نے عام لوگوں کے اجتماعی شعور کو بیدار نہ کیا، بلکہ الٹا اس سے فرماں رواؤں اور ان کے حاشیہ نشینوں کے خود غرضانہ ظلم و استبداد کو کھل کھیلنے کے مواقع مل گئے۔

قومیت کے شعور کا فقدان

اس دوران میں مسلمانوں میں قومیت کے شعور کو بھی اُبھرنے کا موقع نہیں ملا۔ وحدتِ اسلامی کے عقیدے کی رُو سے، اور یہ عقیدہ قرونِ وسطیٰ کی روح کے عین مطابق تھا، اللہ تعالیٰ کی نظر میں سارے مسلمان برابر تھے۔ اور اس عقیدے کے پیشِ نظر اسلام کا مقصد زمین پر اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کرنا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی سرحدوں کے اندر ایک مثالی ریاست یعنی دارالاسلام قائم بھی کر لی، جس کا اساس قومیت کی نفی تھی۔ اس مثالی ریاست یا دارالاسلام کی رعایا وہ سب لوگ تھے جو اسلام کے مذہبی قانون کو بحیثیت مسلمان کے، یا بحیثیت ذمی کے یا ایک اسلامی ریاست کے ساتھ معاہدہ کرنے والوں کی حیثیت سے، اپنے لئے لازم اطاعت سمجھتے تھے۔ یہ دارالاسلام کا عقیدہ اس مثالی عالم گیر سلطنت کی طرف ایک قدم تھا، جس کا تصور قرونِ وسطیٰ کے مسیحی کلیسا میں

بھی ملتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس بات کا انکار نہیں ہو سکتا کہ دارالاسلام کے اس عقیدہ کے باوجود انسانی فطرت کے اندر علاقائی تعلق اور ایک ملک کے ساتھ وابستگی کا جو قدرتی رجحان پایا جاتا ہے، وہ اسلامی تاریخ کے مختلف[1] ادوار میں برابر ابھرتا رہا ہے۔ خود اسلام کی ابتدائی صدیوں میں عربوں کا فخر و غرور ناقابلِ برداشت ہو گیا تھا۔ اور شمالی عرب اور جنوبی عرب کے قبائل نے دور دراز اسپین تک اپنی باہمی رقابتوں کو جاری رکھا، اسی نسلی شعور کا نتیجہ تھا کہ شیعیت کو زیادہ تعداد میں ماننے والے ایران سے ملے۔ نیز امویوں کی جگہ عباسیوں کا برسرِ اقتدار آنا بہت حد تک عربوں اور ایرانیوں کی نسلی کش مکش کا نتیجہ تھا، بے شک راسخ العقیدہ اسلام نے نظری اعتبار سے مسلمانوں کے اس قسم کی قومی تقسیموں اور قومی فخر و غرور کو کبھی تسلیم نہیں کیا، بلکہ اس کے برعکس ان چیزوں کی مذمت کی، اور انہیں قبل اسلام کے عہدِ جاہلیت کی نشانی قرار دیا۔ بات یہ ہے کہ اسلام ایک اخلاقی سیاسی وحدت کا علم بردار تھا، اور اس وحدت کے علاوہ وہ کسی دوسری وحدت کو قبول نہیں کرتا تھا، وہ لوگوں کے زبان، رنگ اور نسل کے

---

[1] ۔ بنو امیہ کے بعد جب بنو عباس کی حکومت آئی، تو اسپین میں ایک الگ اسلامی حکومت بن گئی۔ بنو عباس کے عہد میں اسلامی دنیا کے ہر حصے میں علاقائی بنیادوں پر مختلف اسلامی حکومتیں وجود میں آئیں اور اس طرح کی حکومتوں کا سلسلہ آج بھی برابر جاری ہے۔ مترجم

اختلافات کو غیر اہم اور خالصاً مادی نوعیت کا سمجھتا تھا۔ خدا کی نظروں میں، اور اس کے نتیجے میں انسانی منطق کے اعتبار سے بھی، قرون وسطیٰ کے مذہبی اور اخلاقی تصورات کے مطابق انسانوں کے صرف دو ہی طبقے ہو سکتے تھے، ایک مومنین یعنی مذہب کو ماننے والوں کا طبقہ اور دوسرا منکرین یعنی مذہب کو نہ ماننے والوں کا طبقہ، "مومنین" یا مختصراً مسلمانوں کا طبقہ وہ تھا جنہوں نے خدا کے دین یعنی اسلام کو برحق تسلیم کیا اور اپنے آپ کو اس کا تابع بنایا۔ ان لوگوں پر شریعت اسلامی کا پوری طرح اطلاق ہوتا ہے۔ یہ شریعت اسلامی کے مکمل ہونے کو بخوشی تسلیم کرتے اور اس کی تمام سختیوں کو برداشت کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ مذہب کے معاملے میں اپنی اخلاقی ذمہ داری محسوس کریں اور اس کے مطابق عمل پیرا ہوں اور اسلامی ریاست کے دیانت دار باشندے ہونے کی حیثیت سے ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے مذہبی قوانین کو جانیں اور ان کا احترام کریں۔ "ایک اچھے مسلمان" کی تعریف اگر ہم اپنی اس صدی کی زبان میں کریں تو اسے ایک "اچھا محبِّ وطن" کہہ سکتے ہیں۔

اسی طرح غیر مسلم بھی دو گروہوں میں منقسم تھے۔ ایک گروہ اہل کتاب یعنی یہودی، عیسائی اور زردشتی مذہب والوں کا۔ ان کا اگر اسلامی حکومتوں سے معاہدہ ہو جاتا تو وہ اسلامی حکومتوں کی رعایا بن کر رہ سکتے تھے۔ اس شکل میں وہ بدستور اپنی جائدادوں کے مالک

رہتے اور ان کو اپنی مذہبی رسوم ادا کرنے کی بھی اجازت ہوتی البتہ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ نہیں کر سکتے تھے۔ گو اسلامی مملکت اور اس کے مذہبی قانون کے معاملے میں ان کی قانونی ذمہ داری مسلمانوں کے مقابلے میں کم تھی، لیکن ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوتی تھی۔ غیر مسلموں کا دوسرا گروہ بت پرستوں کا تھا، جو کہ سرے سے خدا کے وجود کے منکر تھے۔ نظری اعتبار سے ان کے خلاف اسلام کا جہاد بدستور جاری ہے۔ یہ "کافر" ہیں۔ ان پر یا تو سختی کرنی چاہیئے اور یا انہیں مجبور کرنا چاہیئے کہ وہ سچے دین میں شامل ہو جائیں۔ اس سخت قانون سے صرف ہندوؤں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا، جو باوجود اس کے کہ اہل کتاب میں سے نہیں تھے۔ لیکن چونکہ ان کی تعداد بہت زیادہ تھی اور ان کی اپنے مذہب کے ساتھ سخت قسم کی وابستگی کو نہ ختم کیا جا سکتا تھا، اور نہ بدلا ہی جا سکتا تھا، اس لئے ان کے ساتھ اہل کتاب عیسائیوں کا سا سلوک روا رکھا گیا۔ اور یہ چیز اس بات کا ثبوت ہے کہ اسلامی قوانین میں بڑی لوچ ہے۔

انسانوں کو تقسیم کرنے کا یہ مذہبی تصور، اگرچہ انہیں زبان اور نسل مختصراً ان کی جسمانی خصوصیات کی بنا پر تقسیم کرنے کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہمدردانہ ہے، مسلمانوں میں قومی ریاستوں کے ظہور پذیر ہونے اور بالخصوص قومیت کے شعور کی نشو و نما میں بڑی رکاوٹ ثابت ہوا ہے۔ اس نے ان کے ہاں مقامی اور قریب کے اجتماعی اور

اقتصادی مرکز نہیں بننے دیئے۔ یورپ میں مرکزیت کی جگہ جب لامرکزیت آئی تو اس کی وجہ سے لوگوں کے لئے ارتقاء کے وسیع امکانات پیدا ہوئے اور زیادہ سے زیادہ آزادی کے جذبے نے لامرکزیت کی مدد سے انسانوں کو اس قابل بنایا کہ وہ اپنی قدرتی صلاحیتوں کو سیاسیات کے علاوہ زندگی کے دوسرے میدانوں میں بھی بروئے کار لائیں۔ یہاں یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ یورپ کی مذہبی اصلاحات ان ملکوں میں زیادہ کامیاب ہوئیں، جہاں کا زرعی نظام بڑے جاگیرداروں اور حکومت کے اثرات سے آزاد چھوٹے چھوٹے مالکان زمین پر مشتمل تھا۔

بین الاقوامی تجارت کے راستوں کی تبدیلی، اور دوسرے ملکوں میں نوآبادیات کے قیام کے بعد سے یورپی اقوام کی آسودگی اور فارغ البالی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ یورپ کے یہ آباد کار اور تاجر امراء اور شرفا کی صفوں سے آگے نہیں آئے تھے۔ بلکہ وہ یورپ کے بعض پست ترین طبقوں سے ابھرے تھے انہوں نے اپنی صنعتوں اور محنت مشقت سے خوب دولت کمائی۔ اور اس کی بدولت وہ مرکزی اقتدار سے آزاد ہو گئے۔ اس کے علاوہ ان نوآبادیوں نے ان لوگوں کے لئے ترکِ وطن کے مواقع بھی بہم کر دیئے۔ جن پر ان کے اپنے وطن میں مذہبی اور سیاسی بنا پر ظلم و ستم توڑے جاتے تھے۔ اس کے برعکس اس زمانے میں مسلمانوں کے لئے

اس طرح ترکِ وطن کر کے دوسرے ملکوں میں جاکر آباد ہونے کے کوئی مواقع نہ تھے۔ لیکن اگر ان کو ترکِ وطن کے یہ مواقع حاصل بھی ہوتے، تو یہ بات یاد رہے، اور یہاں یہ بات کافی وزنی ہے، مسلمان اِن مواقع سے زیادہ فائدہ اٹھا نہ سکتے۔ کیونکہ یہ ترکِ وطن کے بعد نوآبادیات میں بھی شریعتِ اسلامی کے جامد ضابطوں پہ اسی سختی سے عامل رہتے، جس طرح ان کے بھائی جو ترکِ وطن نہ کرتے، عامل تھے، ہم نے یہ نتیجہ اس واقعہ سے نکالا ہے کہ سترھویں صدی کے بعد یورپ کے ملکوں میں بسنے والے مسلمان جو ترکوں کے بجائے یورپی قوموں کی حکومتوں کے ماتحت آگئے انھوں نے یہ تو پسند کیا کہ وہ اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر دارالاسلام میں واپس ہجرت کر آئیں، بمقابلہ اس کے کہ وہ نئے ماحول میں رہیں جو ان کے لئے بالکل اجنبی تھا۔ ان لوگوں کو ان کی مذہبی اصولوں اور بے لوچ عقائد سے وابستگی نے اس امر سے باز رکھا کہ وہ اس سرزمین کو جس میں وہ آباد ہو چکے تھے، اپنا سکیں۔ چنانچہ جب وہاں سے مسلمان ترکوں کی فوجوں نے کوچ کیا، تو یہ لوگ بھی اپنا گھر بار، دولت اور عزت وحشمت سب کچھ پیچھے چھوڑ چھاڑ کر مہاجرین کی حیثیت سے ان کے ساتھ ہو لئے۔ مشرقی یورپ میں ترکی فتوحات کا آخر میں یہی انجام ہوا۔ اور اسی طرح ہندوستان میں بھی مغل حکومت کے خاتمے کے بعد مسلمان ناراض ہو کر کنارہ کش ہو گئے، اور ترقی

کے تمام مواقع بلند حوصلہ ہندوؤں کے لئے چھوڑ دیئے جنہوں نے بڑے شوق و رغبت سے یورپی، انگریزی تہذیب سیکھی اور اس سے خوب فائدہ اٹھایا۔

مسلمانوں کے ذہن کا یہ اختلاف اٹھارھویں صدی کے بعد سے نقطۂ عروج کو پہنچتا ہے۔ اُدھر یورپ میں مذہبی جنگوں نے آگے چل کر متحدہ دفاعی جدّ و جہد کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اور اِدھر دنیائے اسلام میں جو ایک ربط و اتحاد تھا، وہ ٹوٹ چکا تھا۔ اور اس کی جگہ جاگیردارانہ قسم کی ریاستیں وجود میں آگئی تھیں۔ لیکن بدقسمتی یہ تھی کہ متحدہ اسلامی سلطنت سے ان الگ ہونے والی علاقائی ریاستوں کو کسی قسم کے قومی شعور سے تقویت نہ مل سکی۔ اسی زمانے میں نئی زندگی کا آغاز ہوا، اور اس کی اس نئی زندگی کا مابعدالطبیعاتی اساس "قومیت" اور انفرادیت کا شعور تھا۔ چنانچہ ہوا یہ کہ یورپ کی مرکزی حکومت کی جگہ جو قرونِ وسطیٰ میں رائج شدہ مذہبی وحدت کے تصور پر چلتی تھی، یورپی اقوام کی علاقائی وحدتوں نے لے لی۔ اب ایک شاہی خاندان کی وجہ سے کسی ریاست کو استحکام اور اقتدار نصیب نہیں ہوتا تھا، بلکہ یورپ کی ترقی کن اور وسعت پذیر تہذیب کے نتیجے کے طور پر وہاں کے عوام الناس، متوسط طبقے، صنعت کار، تاجر اور عام شہری، قوم کی ریڑھ کی ہڈی بن گئے، اور قوم کی دولت و ثروت اور سیاسی

اقتدار کا رُخ چند خرچ کرنے والوں کے بجائے بہت سے پیدا کرنے والوں کی طرف مڑ گیا۔ چنانچہ ریاست کا نظام کار بتدریج صنعتی اور قومی بنتا گیا۔ اور وہ صلاحیتیں اور قوتیں جو اب تک پوشیدہ تھیں، یا وہ حکمرانوں کی بے جا خواہشات کی نذر ہو رہی تھیں، عوام کی زندگی کے زرخیز گوشوں سے باہر آکر نشو و نما پانے لگیں۔ یورپ میں یہ جو قومیت کی رُوح اُبھری تو اس کا باعث اقتصادی اور رُوحانی حالات تھے، چنانچہ وہاں جو مذہبی جنگیں لڑی گئیں تو ان میں جہاں ایک طرف دنیاوی اسلحہ کام میں آئے، وہاں دوسری طرف تھیورنگیا میں یورپ والوں کو چاندی کی جو نئی کانیں ملی تھیں، ان سے بھی مدد لی گئی۔

انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں مقامی اور علاقائی مفادات نے ہمیشہ شاہنشاہی مفادات سے ٹکر لی ہے۔ اور اسلامی مشرق بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں رہا۔ یورپ میں جو قومیت کو فروغ ہوا تو اس میں مقامی مفادات نے شعوری طور پر بہت حصّہ لیا تھا۔ اس قومیت نے یورپ میں تنظیم کا ایک نیا اساس پیدا کیا، اور اس مابعدالطبیعاتی افسانہ کو ختم کر دیا کہ اس زمین پر خدا کی بادشاہت قائم ہونی چاہیئے اس کے برعکس اس کی جگہ زمین پر انسان کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس قومیت نے اس خیال کو کہ موت کے بعد آسمانی جزا و سزا کا وعدہ ہی اس زندگی کا

اصل مقصد ہے، برطرف کر دیا، اور کوشش یہ کی کہ اس مختصر سی دنیاوی زندگی میں انسان کو اس کے عمل کا اجر مل جائے، اور قومیت نے فعلاً اس دنیاوی زندگی کو تمام مادی کامیابیوں کے ثمرات سے مالا مال کرنے کا رجحان بھی پیدا کیا۔ قومیت کا یہ شعور اس بات کے اعتراف کا نتیجہ نہ تھا کہ زندگی ابدی اور سماوی ہے اور دنیا میں یہ جو صورت اختیار کرتی ہے، اس کو خدائی احکام کے سامنے جھکنا ضروری ہے۔ اس کے برعکس قومیت نے معاشرے کی بنیاد انسانی قوانین پر رکھی، جو قابلِ تغیر اور حالات و کوائف کے ساتھ بدلنے والے تھے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے قومیت نے فرائض کے مقابلے میں حقوق کو زیادہ اہمیت دی، حالانکہ قرونِ وسطیٰ میں اجتماعی نظام کا جو تصور تھا، اس میں فرائض کی حیثیت رہنما اصول کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپی اقوام کی ذہنیت میں آزادی کا عنصر زیادہ غالب آنے لگا۔ آزادی یعنی اجتماعی اور اخلاقی قیود سے آزادی لوگوں کا نصب العین بن گیا اور سب اسی کی طرف کھنچنے لگے۔ اس کے ساتھ ساتھ جب زندگی میں اونچے طبقوں کے امتیازات کا عمل دخل کم ہوا تو معاشرے کے بڑی تعداد والے نچلے طبقوں کو موقعہ ملا کہ وہ دولت پیدا کرنے والے گروہ میں کثیر تعداد میں بھرتی ہو سکیں۔ اس کی وجہ سے یورپ میں اجتماعی ترقی کی رفتار حیرت انگیز طریقے سے تیز ہو گئی۔ چنانچہ وہ انسانی صلاحیتیں جو اب تک استعمال میں نہیں آئی تھیں، اور وہ قوتیں جو ہنوز سوئی پڑی تھیں، ایک بارگی

اُبھر کر بر سر کار آگئیں، اس میں محرک جذبہ انسان کا خود اپنے متعلق یہ نیا عقیدہ تھا۔

قومیت نے جس کے تحت الشعور میں مادیت بھی تھی، یورپ کی قوموں کو بے حساب فائدہ پہنچایا۔ جہاں قرونِ وسطیٰ کی دینیاتی روح نے نہ ٹلنے والی تقدیر کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کو ہی زندگی کا مقصد بنایا تھا وہاں قومیت نے انسانی دماغ کے سامنے نئی نئی راہیں کھول دیں۔ اس نے انسانوں کو یہ تعلیم دی کہ انسانی مساوات کا دور اسی دنیا میں شروع ہو گا اور ظالم و جابر فرماں رواؤں سے جو اپنے حق میں بزعم خود پروانۂ خداوندی لئے پھرتے ہیں، یہیں لڑا جا سکتا اور انہیں ہٹایا جا سکتا ہے۔ اونچے طبقوں کے امتیازات و حقوق کے تقدس کا احترام اس سے زیادہ نہ کیا جانے لگا، جتنا کہ پرانے وقتوں کے خیالات کا کیا جاتا تھا۔ سائنس کی تیز رفتار ترقی کے ساتھ ساتھ افراد کو اونچے حقوق یافتہ طبقوں کے امتیازات کی قید سے بھی آزادی ملتی گئی۔

اب جہاں یورپی عوام نے کلیسا اور پوپ دونوں کے خلاف بغاوت کر دی اور وہ غیر ملکی جابر حکمرانوں کے خلاف صف آرا ہو گئے جس کی وجہ سے ان کے ہاں اٹھارھویں صدی کے بعد سے برابر قومی ریاستیں وجود میں آتی گئیں، وہاں مسلمان بدترین قسم کے استبداد اور معاشی ذہنی استحصال اور لوٹ کھسوٹ کو برداشت کرتے رہے

اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی تقدیر پرستی اور اٹل مقدر پر خاموشی سے راضی ہو جانا ایک عام معمول بن گیا اور غلطی سے اس چیز کو اسلام کے عقائد میں بھی شامل کر لیا گیا، حالانکہ اسلام اعمال اور ان کی جزا پر زور دیتا ہے، اور اعمال کی اچھائی اور برائی کو پرکھتا اور انہیں معیار ٹھہراتا ہے، اور اس کے نزدیک دوسری دنیا میں فلاح و کامیابی کا نتیجہ ہوگی، اس دنیا کی زندگی میں اخلاقی تقاضوں کے مطابق رہنے اور کام کرنے کا۔ الغرض آج مشرقی لوگوں میں جو ہم تقدیر پرستی دیکھتے ہیں، تو وہ اسلام کی تعلیمات کی وجہ سے نہیں ہے۔ (روسیوں کی اصطلاح "nitchevo" میں کہیں زیادہ تقدیر پرستی ہے، اور عیسائیوں کے کالون عقیدے والوں کا تقدیر کے بارے میں جس طرح کا عقیدہ ہے، اس کی رُو سے تو انہیں بھی مسلمانوں کی طرح بخوشی ترکِ دنیا کر لینی چاہیئے) بلکہ وہ نتیجہ ہے صدیوں کے جسمانی اور روحانی استبداد کا، جس کا تختۂ مشق اہلِ مشرق بنتے آئے ہیں، اس استبداد کے اسباب ہم نے اوپر بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

یورپ کے مقابلے میں اسلامی دنیا کس قدر پیچھے ہے، اس کے افسوسناک پہلو اس وقت خاص طور سے نمایاں ہوتے ہیں جب ہم دونوں کے متعلقہ اعداد و شمار دیکھتے ہیں۔ چنانچہ جہاں باقاعدہ سرکاری مردم شماری کی بنا پر ہمیں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ یورپ

میں عیسائیوں کی کتنی آبادی ہے، وہاں ہم مسلمانوں کی تعداد کے متعلق اس طرح کا باقاعدہ علم نہیں رکھتے۔ عام طور پہ مسلمانوں کی تعداد ۲۵ اور ۳۰ کروڑ کے درمیان بتائی جاتی ہے۔ لیکن اس تعداد کی جو تفصیلات ہیں، ان میں کافی اختلاف ہے۔ اعداد و شمار کے معاملے میں انسانی تخیل حدود کو پھاندنے کے لئے اکثر تیار رہتا ہے اور بعض لوگ اس خیال سے کہ اس سے ان کی اہمیت بڑھ جائے گی وہ مسلمانوں کی تعداد کو اور بڑھا دیتے ہیں۔ تعداد بڑھانے میں یہ مبالغہ آرائی تو خاص طور سے ان علاقوں کے بارے میں جو یورپی تسلط میں نہیں ہیں، جیسے سائبیریا، چین اور افریقہ، قابو سے باہر ہے۔ ہاں اس سلسلے میں ایک چیز یقینی ہے۔ جب ہم مسلمانوں کی تعداد کا زیادہ سے زیادہ اندازہ لگالیں اور ان کی تعداد کا مقابلہ اتنی ہی تعداد کے یورپی لوگوں سے کریں اور دونوں کی اقتصادی اور معنوی صلاحیتوں کا جائزہ لیں تو ہم دہشت زدہ ہو کر رہ جائیں گے۔ مسلمانوں کی غالب اکثریت یعنی تقریباً ۹۰ فی صد بالکل غریب اور حقیقی معنوں میں ان پڑھ ہے۔ معنوی اور اقتصادی دونوں اعتبار سے مسلمانوں کی یہ پس ماندگی، ان کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملکوں تک میں خوفناک حد کو پہنچی ہوئی ہے۔

ہندوستان، مصر اور ترکی (جب تک اس کا رسم الخط عربی رہا) میں ۸۰ فی صد مرد اور ۹۰ فی صد عورتیں ان پڑھ ہیں۔ اسی طرح ان ملکوں

میں دولت کی تقسیم بھی دہشت ناک حد تک غیر مساویانہ ہے۔ آبادی کی بہت بڑی اکثریت ذلّت آمیز غربت میں زندگی بسر کرتی ہے، اور اس کی اوپر کی ایک باریک سی تہہ ہے جو گلچھرّے اڑاتی ہے۔ مشرق کا مستحکم متوسط طبقہ اب کہیں ڈھونڈھے سے بھی نہیں ملتا۔ باہر سے جو لوگ آتے ہیں، اور سرسری طور پہ ان ملکوں کی سیاحت کرتے اور وہاں کے اوپر کے طبقے سے ملتے ہیں، وہ اس طبقے کی آسودہ حال زندگی کو وہاں کے عوام الناس کی زندگی سمجھ بیٹھتے ہیں۔ ہندوستان کے راجاؤں اور نوابوں کے متعلق عام طور پہ جو خیالات دماغوں میں پیدا ہو چکے ہیں، ان کی وجہ سے باہر سے جانے والوں کی نظریں دھندلا پڑ جاتی ہیں اور وہ کثیر التعداد عوام الناس کی حقیقی غربت و افلاس کو نہیں دیکھ پاتے۔ اسی طرح اسلامی ملکوں میں اچھے کھاتے پیتے لوگوں کی مسرفانہ مہمان نوازی اور فیاضی عام آبادی کی آسودگی کے بارے میں ایک غلط تصور پیدا کر دیتی ہے۔ اگر ہم ان باتوں کو پیش نظر رکھ کر جملہ اعداد و شمار کا مطالعہ کریں تو اسلامی مشرق کے زوال کا نقشہ اپنے صحیح اور واضح خطوط میں ہمارے سامنے آجائے گا۔

اسلامی دنیا آج بھی یورپ سے اسی طرح برسرِ جنگ ہے، جیسا کہ وہ کئی صدیاں پہلے تھی، لیکن اب ایک طرف معاشی اور معنوی اسلحہ کی کمی ہے، اور دوسری طرف ان کا اعلیٰ

سے اعلیٰ تر ہونا ہے۔ ظاہر ہے، یہ صورتِ حال مشرق کے ہر اقدام کو خواہ وہ فعالی ہو یا انفعالی لازماً ناکام بنائے گی

یورپی کلچر کو اپنانے کی ضرورت

یہ خیال کہ اسلام یورپ سے بغیر تعلق رکھے خود اپنی اندرونی صلاحیتوں کی بدولت دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے اور وہ اس طرح ایشیا و افریقہ دونوں کے لئے ایک خطرہ بن سکتا، اور وہاں یورپی اقتدار کی جگہ لے سکتا ہے، سوڈان کی مہدی تحریک اور ابھی حال ہی میں عربستان کی وہابیت کی شکل میں رونما ہوا۔ سوڈان کے مہدیوں کو شروع شروع میں کامیابی ہوئی تھی اور انہوں نے برطانوی مصری فوجوں کو جس طرح سخت نقصانات پہنچائے، اس کا سبب زیادہ تر یہ تھا کہ جس ملک میں یہ مہدوی لڑ رہے تھے، وہاں تک پہنچنا مشکل تھا۔ نیز وہ ایک الگ تھلگ صحرائی علاقہ تھا۔ یہی بات جزیرہ عرب کی وہابیت کی فتوحات اور اس کی تیز رفتار کامیابی کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ کیونکہ کوئی یورپی طاقت کامیابی سے ان سے ان کے صحرائی علاقوں میں نہیں لڑ سکتی۔ ابن سعود کے عقل مندانہ ضبط اور اس

کی حکومت کے دینداران رویہ نے بہت سے مسلمانوں پر بڑا حوصلہ افزا اثر چھوڑا ہے، جنھوں نے کہ بہت دل شکستہ ہو کر اسلام کے زوال اور اسلامی ممالک کو یورپی اقتدار کا مسلسل غلام بنتے دیکھا تھا۔ ابن سعود نے ایک بار پھر جزیرہ عرب کے بہت بڑے حصے کو ایک مضبوط مرکزی حکومت کے تحت متحد کر دیا اور جزیرہ عرب کو ایسی حکومت خلفاء راشدین کے بعد سے آج تک نصیب نہیں ہوئی۔ بے شک ابن سعود نے اپنی سلطنت کے قانونی نظم ونسق میں حنبلی فقہ کے بے لوچ اور سخت گیرانہ اصولوں کو نافذ کیا۔ لیکن تنگدلانہ تشدد کی وہ انتہا پسندیاں جن کا ذکر بعض مصری اہل قلم کیا کرتے تھے ہیں نے جزیرہ عرب میں کہیں بھی نہیں دیکھیں۔ اسلام اپنی اصلی اور حقیقی پاکیزگی میں آج جزیرہ عرب میں کارفرما ہے، لیکن یہ اسلام صحرائی خصوصیات والے ملک میں ہی آج اس طرح چل سکتا ہے۔ اگر وہابی سلطنت اردگرد کے ہمسایہ علاقوں تک وسیع ہو جائے، تو وہاں یقیناً اسے ان مفتوحہ علاقوں کے معاشی اور اجتماعی نظام سے مطابقت کرنا ہوگی اور اس طرح ان نئے حالات میں وہابیت کو جو مراعات دینی پڑیں گی ان کی وجہ سے اسے لازماً یورپ کے قریب آنا پڑے گا۔

جب ساتویں صدی مسیحی میں اسلام آیا اور اسلامی عربی فتوحات کا آغاز ہوا تو اس وقت بھی بالکل یہی قدرتی عمل ظہور پذیر ہوا تھا۔ اور اسلام نے نو مفتوحہ علاقوں کے معاشی اور اجتماعی حالات کے ساتھ

مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ آج اسلام کا مستقبل صرف اسی صورت میں محفوظ ہو سکتا ہے۔ اگر وہ اس کلچر کو اپنائے جو نشاۃ ثانیہ کے بعد یورپ میں پھلا پھولا۔ اور جو مشتمل ہے نظم ونسقِ مملکت، سائنس فلسفہ اور آرٹ پر۔ یورپ کے اس کلچر کو اپنانے کا یہ عمل بتدریج ہونا چاہیئے اور اس میں مشرق کے خصوصی حالات کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیئے۔ جو کچھ کہ یورپ میں ہو چکا ہے، اس کی اندھا دھند نقالی، جس کو اختیار کرنے پر لازماً اعتراضات کی بھی بھرمار ہوگی، ایک صحت مند اور صحیح الامتزاج متوازن کلچر کبھی پیدا نہیں کر سکے گی، بلکہ الٹا لوگوں کے جذبات کو ان کی اپنی روایات سے منحرف کر دے گی۔ مشرق کو خود اپنے افکار و خیالات پر اعتماد کرنا چاہیئے اور اسلام کو امیر و غریب دونوں کے لئے بدستور مشعلِ ہدایت رہنا چاہیئے نیز وہ کارنامے جن پر کہ اسلامی کلچر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے مستقبل کی تعمیر و ترقی میں ان کا ادب و احترام برابر ملحوظ رکھنا چاہیئے مسلمانوں کو اسلام کی صحیح روح سائنس کی دنیا میں آزادانہ تحقیق۔ یہ عقیدہ کہ اس دنیا میں انسانی زندگی کو خدا تعالیٰ کی قوتِ عدل و انصاف چلا رہی ہے، اور جو خداوند تعالیٰ کو مانتا ہے وہ اس قوت سے مساوی طور پر بہرہ ور ہوتا ہے، اور اسلام کے پیغامِ وحی کی جمہوریت دوستی

نیز انسانی زندگی کا یہ اصول کہ منصفانہ اور نیک اعمال کا بدلہ لازمی طور پہ ملتا ہے — ان چیزوں پر اپنے فطری اور صدق دلانہ ایمان کو بے بنیاد اور رائج الوقت فیشن ایبل نظریوں کی خاطر خواہ وہ مغرب کی پیداوار ہوں، یا مشرق کی، کبھی نہیں چھوڑنا چاہیئے۔

ایک قوم کی مجموعی شخصیت، نتیجہ ہوتی ہے۔ اس کی پوری تاریخ کا اور برے اور اچھے اثرات اس پر یکساں اثر انداز ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے ذی اثر اور ترقی یافتہ طبقوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی قوم کو سہولت پسند نقالی کے مضرت رساں اثرات اور دل لبھانے والے نعروں سے بچائیں، اور انسانیت کے مناسب مفید اور اخلاق کو بلند کرنے والے اصولوں پر جو تمام دنیا میں، ہمیشہ ہمیشہ ایک سے رہے ہیں، خود عمل کر کے دوسروں کے لئے نمونہ بنیں اور اس طرح اپنی قوم کو ان اصولوں کی تلقین کریں۔ یہ اصول انصاف پسندانہ منطقی سوچ بچار اور با اخلاق اعمال پر مبنی ہیں۔ ان لوگوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ایک قوم کی طاقت کا راز اس کے افراد کے باہمی اتحاد، اُن کی آسودگی اور ان میں اخلاقی ذمہ داری کے احساس میں مضمر ہے۔ اور یہ کہ کوئی مذہبی آدمی اپنی امتیازی اقتصادی حیثیت سے، اخلاقی نقطہ نظر سے فائدہ اٹھانے کا مجاز نہیں ہے جب کہ اس کے ہم مذہب اور ساتھی بھوکوں مر رہے ہیں اور روحانی انحطاط کی دلدل میں دھنسے جا رہے ہیں۔ کوئی ملت اس وقت تک

آسودہ حال نہیں ہو سکتی، جب تک اس کی اکثریت کو جو اس ملت کی آسودہ حالی کے لئے سب سے زیادہ محنت و مشقت کرتی ہے، چند خود غرض آدمی خدا کی نعمتوں سے محروم کئے بیٹھے ہیں۔ اسلام کا یہ تصور کہ خدا تعالیٰ نے سب انسانوں کو برابر اور آزاد پیدا کیا ہے، ایک مضبوط ترین بنیاد ہے۔ اجتماعی ذمہ داری کے احساس کی اور اس پر یقیناً ایک عظیم قوم کی عمارت اٹھائی جا سکتی ہے۔

یورپی کلچر نے صدیوں میں مسلسل ارتقائی منزلیں طے کر کے موجودہ ترقی کی ہے، اور اس طرح سے یہ اپنے معاشرے کی تمام تہوں میں سرایت کر سکا ہے۔ آج ہمیں یورپی کلچر یوں نظر آتا ہے جیسے وہ اپنی تمام خوبیوں اور کوتاہیوں میں یکساں ہے۔ یہ ہمیں ایک مکمل وحدت دکھائی دیتا ہے۔ اور یہ کہ، یہ یورپی ہے، اس بات کا صاف پتہ چلتا ہے۔ اس کے برعکس اہل مشرق کی زندگی میں ہم ایک منہ کھولے ہوئے شگاف کو دیکھتے ہیں جو قدیم اسلامی کلچر کی موجودہ بگڑی ہوئی صورت اور وہاں کے امیروں کے نقل کئے ہوئے آدھے کچے اور آدھے پکے مروجہ یورپی کلچر میں پیدا ہو چکا ہے۔ اس شگاف کو چھلانگوں سے پھلانگ کر پار نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں سب سے بڑی رکاوٹ ضروری سرمائے کی کمی اور عملی امور سے ناواقفیت ہے، اور یہ چیز ترقی یافتہ یورپ تک پہنچنے میں مشرق کے راستے میں بری طرح حارج ہو رہی ہے۔ بہر حال صورت

حال اتنی مایوس کن نہیں۔ ایک چیز جو پہلے بنی ہوئی ہو، اس کے متعلق معلومات حاصل کرنا اور ان معلومات کو دوسرے کے سامنے پیش کرنا کہیں زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اس سے کہ اس چیز کو خام مواد سے پہلے پہل بنانا پڑے۔

آج اسلامی مشرق کو یورپ میں پہلے سے بنی ہوئی چیزوں کے متعلق معلومات حاصل کرنا اور ان کو اپنے ماحول میں منتقل کرنا ہے اور اس معاملے میں مخالفت کرنا محض ایک ہٹ دھرمی ہوگی۔ یورپی صنعتوں سے متعلقہ معلومات کو مشرق میں عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں سب سے پہلے وہ منزل آئے گی جسے جرمن فلسفی کیسرنگ (Keyserling) نے نہایت صحیح طور پر "موٹر ڈرائیور کا کلچر" کا نام دیا ہے۔ میں نے مشرقی ممالک کی سیاحت کے دوران میں دیکھا کہ کس طرح ہندوستانی، شامی، مصری اور چینی قومیتوں کے ڈرائیور اسی چابک دستی اور مشاقی سے موٹر کار کو چلاتے ہیں جیسے کہ کوئی یورپی ڈرائیور۔ موٹر کار جو ایک نشانی ہے یورپ کے صدہا سال کے دقیق ترین ٹیکنیکل ارتقاء کی، آج ان مشرقیوں کی برضا و رغبت اطاعت کر رہی ہے۔ میں نے جزیرہ عرب میں اپنے عرب ڈرائیور کو دیکھا کہ وہ صحرا میں موٹر کار سرپٹ دوڑاتا جاتا ہے اور ساتھ ساتھ آسمان پر ستاروں کو بھی دیکھتا جاتا ہے تاکہ اسے اپنے راستے کا علم بھی ہوتا رہے، جو صحرا میں اس کے سامنے غیر محدود

وسعتوں تک پھیلتا چلا گیا ہے۔ یہ اَن پڑھ عرب ڈرائیور، یورپ کے معنوی کلچر کی اس ایک پیداوار کو بغیر اس کلچر میں عملاً شریک ہوئے، پوری طرح استعمال کرنے اور اسے اپنے صحرائی ماحول میں منتقل کرنے میں پوری طرح قابل ہو گیا ہے نیز میں نے دیکھا کہ عرب کے بدو ابن سعود کے وائرلیس لاسلکی کے اسٹیشنوں کا بڑے اطمینان بخش طریقے سے انتظام کرتے ہیں۔ لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان سب لوگوں کے دماغ ترقی کر کے کب اس درجے پہ پہنچیں گے کہ وہ خود اس کلچر میں نئی تحقیقات کر سکیں۔ اس کے لئے محض معلومات کا حاصل کر لینا کافی نہیں۔ اس درجے تک پہنچنے کے لئے اس کلچر کو معنوی طور پہ اپنے اندر سمونا ہو گا، اور افراد کو اس کلچر کی رُوح پوری طرح اپنانا ہو گی۔ دوسری تہذیبوں کی قدروں کو معنوی لحاظ سے سمونا اور انہیں اپنانا اسلام کی تاریخ میں کوئی انوکھی بات نہیں۔ یہ اسلامی تاریخ کے نامور مفکر ہی تھے جن کی تربیت ارسطو کے فلسفہ پر ہوئی اور انہوں نے مختلف اجزاء سے مرکب کلچر کا ڈول ڈالا اس کلچر نے علم اور اخلاقیات کے ذریعہ

لے بنو عباس کے دورِ خلافت میں بغداد میں جو کلچر معرضِ وجود میں آیا وہ بھی مختلف اجزا سے مرکب کلچر تھا۔ بے شک اس کی روح اور اس کی زبان اسلام اور عربی تھی لیکن اس کے اجزاء اس زمانے کی معلوم دنیا کے ہر حصے سے جمع کئے گئے تھے۔ اس مرکب کلچر کو عالمی اور بین الاقوامی (باقی صفحہ پر)

انسانیت کو اُس کے ابتدائی غیر مہذب درجے سے بلند کیا۔ نیز اسے اخلاقی احساس ذمہ داری کے تعمیری پہلوؤں سے آشنا کیا۔

یورپی کلچر کو معنوی لحاظ سے اس طرح اپنانے سے اسلام کو بحیثیت ایک مذہب کے کوئی نقصان بھی نہیں پہنچے گا۔ بلکہ اس سے اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا آج کے حالات پر انطباق ہو سکے گا۔ اور چونکہ ہر مذہب میں ذاتی اور جبلی طور سے سچائی اور اخلاقی قوت موجود ہوتی ہے اس لیئے لازماً اسلام کی اخلاقی تعلیمات موجودہ زمانے کے حالات سے مطابقت کے بعد انسان کو اس بلند مرتبے تک پہنچانے میں بڑی مددگار ثابت ہوں گی، جو خدا تعالیٰ کی طرف سے انسان کے لیے مقدر ہو چکا ہے۔ مزید برآں جس طرح مسیحی اخلاقیات اور عیسائیت کی مذہبی زندگی کے مختلف پہلو عہدِ حاضر کے فلسفے اور سائنس کی وجہ سے کمزور نہیں پڑے، بلکہ ایک حد تک ان میں رفعت اور پختگی آئی ہے اسی طرح ہم توقع کر سکتے ہیں کہ مسلمان اقوام کی یہ خواہش کہ وہ سائنسی اور اخلاقی اصولوں کے مطابق ہر چیز کو جانیں اور پرکھیں ان میں نشاۃ ثانیہ اور نئی زندگی کو بروئے کار لانے کا سبب ہو گی۔

(بقیہ صفحہ ۱۲۱) رنگ دینے میں یونان، ایران، مصر، شام ہندوستان اور چین سب کی باقیات صالحات کا برابر کا حصہ تھا۔ مترجم

بیداری کے آثار

اسلامی مشرق یورپ کے اوضاع و اطوار کو اپنانے یعنی (Europeanisation) کی طرف بلا رکاوٹ جا رہا ہے اور اس سلسلے میں ترکی سب سے آگے آگے ہے۔ ترکی کا آئین حکومت جمہوری ہے۔ اس نے ان تمام مذہبی زنجیروں کو جو حکومت کے نظم و نسق کو جکڑے ہوئے تھیں، اتار پھینکا ہے، اور حکومت کو مذہبی قانون کی نگرانی سے آزاد کر دیا ہے۔ ترکی زبان کو عربی اور فارسی الفاظ سے پاک کر کے اور اس کو ہر شخص کے لیے سمجھنا آسان بنا کے ترکی نے ایک نئی قومی رُوح کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ اس نے عربی اور فارسی کے صنعت کارانہ رسم الخط کی جگہ زیادہ آسان اور زیادہ سادہ لاطینی رسم الخط اختیار کر لیا ہے۔ اس نے اپنے ہاں نیا نظام قوانین رائج کیا جس کا اساس انسانی عقل و فہم اور انسانی عزم و ارادہ کے آزادانہ فیصلے ہیں۔ ترکی کی یہ نئی زندگی ایک نئے ادب کو نشو و نما دے گی۔ جس کا موضوع

آج کے مسائل ہوں گے ۔ بعض ترکی اہل قلم، ایک عرصہ ہوا، مشرق کے پُرتکلف مُرصع اسلوب اور اس کے روایتی محاوروں کو ترک کر چکے ہیں، اور نئے ترکی ناول کی ایسی صنف ایجاد کی ہے۔ جس کی تاریخ گزشتہ پچاس برس پیچھے کو جاتی ہے، یہ ناول ترکوں کے متوسط طبقے کی زندگی پیش کرتے ہیں، اور انہیں ملی ناولوں کا نام دیا گیا ہے۔ عوام کی زبان کے اوپر آنے کی وجہ سے ڈرامائی ادب بھی کتابی ڈراموں کی تنگنائیوں سے نکلے گا اور یہ ڈرامائی ادب بعینہٖ اسی طرح قومی کلچر کا ذریعہ اظہار بنے گا، جیسے کہ وہ یورپی ملکوں میں بنا

ترکی میں سائنسی طرزِ فکر پر پُرانی روایات کے انکار کا ردِعمل اب تک موجود ہے، اور ترکی تاریخ نویسی اور اس کا علم لسان آج بھی اس کوشش میں ہے، اور یہ کوشش اس کے ہاں بڑے جوش و خروش سے برابر جاری ہے کہ جس طرح بھی ہو، تاریخ قدیم کے مشہور "ہیروز" کو جو کبھی ایشیائے کوچک، عراق اور دوسری پرانی قوموں میں ہو چکے ہیں، ترکی نسل کا ثابت کیا جائے، نیز یہ ثابت کیا جاتے کہ عالمی کلچر کی پیدائش سب سے پہلے تورانی سرزمین میں ہوئی تھی، اسی طرح ترکی زبان میں نئے الفاظ گھڑنے کی مہم جو کہ اسی نئے دور کا لازمی نتیجہ تھی، بسا اوقات مزاحیہ جملوں اور لطیفوں کا نشانہ بن چکی ہے۔ اس سلسلے میں بعض ضرورت سے زیادہ جوشیلے حضرات "کلچر" کے لفظ کو ترکی زبان کے فعل (Kyltyrmak) "ہوٹل" کے لفظ کو ترکی کے لفظ ([illegible]) سے جس کے معنی چڑھنے کے ہیں

(Tunnel) یعنی سرنگ کے لفظ کو ترکی لفظ Tunel سے جس کے معنی تاریک جگہ کے ہیں، ماخوذ ثابت کرنے کے خواہاں تھے تاکہ اس طرح وہ ترکی نسل اور ترکی زبان کی قدامت ثابت کر سکیں۔ بہرحال اس قسم کی لغزشوں کے باوجود یہ بات بغیر کسی تردید کے ڈر کے کہی جا سکتی ہے کہ ترکی اس بوسیدہ نظام تعلیم سے جس کا تمام تر زور رٹنے اور حفظ کرنے پر ہوتا تھا، یکسر آزاد ہو چکا ہے اور اب وہ ان مسائل سے عہدہ برآ ہو رہا ہے، جو علم و دانش کے مسائل ہیں اور جو، اس ردِ عمل[1] کے نرم پڑ جانے کے بعد لامحالہ ترکی کے غور و فکر کو سود مند راہوں پر ڈال دیں گے۔

ایران میں بھی ہم اسی قسم کی قوتوں کو ابھرتے دیکھتے ہیں گو یہ بعد میں ابھری ہیں اور یہ عملاً اتنی انتہا پسند بھی نہیں۔ ایرانی انقلاب کے فوراً بعد ایران میں قومیت کا شعور پیدا ہوا اور اس نے بڑے مؤثر انداز میں بعض شیعہ عناصر کی انتہا پسندیوں کو معتدل بنایا۔ بہائیت جو ایرانی عوام میں کافی پھیل گئی ہے، پہلے کی طرح اب نشانۂ ستم نہیں بن رہی[2] اور تو اور زردشتی مذہب کے اصول، جو ایران سے ختم ہو چکے تھے، اب

---

[1] یعنی ہر قدیم ہیرو کو ترکی ثابت کرنا اور ہر لفظ کو ترکی اصل سے ماخوذ سمجھنا، نیز تورانی سرزمین کو عالمی کلچر کا سرچشمہ بنانا۔ مترجم

[2] ابھی حال میں ایران سے جو خبریں آئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی رجعت پسندی نے پھر بہائیوں کو اپنا نشانہ بنایا ہے، چنانچہ بہائیوں کی بعض عبادت گاہیں گرائی گئیں اور ان کے مکانات کو جلایا گیا۔ مترجم

نئے سرے سے پھر وہاں بار پار رہے ہیں اور زرتشت کے ماننے والے آزادی سے اپنی تنظیم کر سکتے ہیں، ایرانی حکومت نے یورپی نمونے پر اسکول قائم کئے ہیں اور بعض ایرانی فارسی زبان کو لاطینی رسم الخط میں لکھنے کا خیال رکھتے ہیں۔ انہوں نے فارسی زبان کو عربی الفاظ سے پاک کرنے کی مہم تو پہلے سے ہی شروع کر رکھی ہے، اور ان کی کوشش یہ ہے کہ فارسی ادب میں باہر سے داخل کئے ہوئے اجنبی عناصر کی جگہ قدیم ایرانی مواد کو لایا جائے۔ گو نیا فارسی ادب جدید ترکی ادب کے پائے تک ابھی نہیں پہنچا، لیکن ایک ہندوستانی[له] مسلمان سر محمد اقبال کی جو فارسی میں شعر کہتے تھے، شاعرانہ تخلیقات اس سلسلے میں قابلِ ذکر امتیاز رکھتی ہیں۔ جدید ایران کے معنوی رجحانات بلاشک و شبہ قوم پرستی کے ہیں، اور وہ بتدریج یورپی طریقے اختیار کرتا جا رہا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی نئی زندگی کے نصب العین قدیم ایرانی تاریخ میں بھی ڈھونڈتا ہے۔

ہندوستان میں دسویں صدی عیسوی کے بعد اسلام نے مسلمان حکمران ریاستوں کی بنیاد رکھی تھی۔ اس سلسلے میں ہندو راجاؤں اور ہندو عوام سے اس کی اکثر ٹھنی رہی جس کی وجہ سے ہندوستان میں اسلام کی حیثیت کچھ تو غیر مسلم رعایا کو قابو میں رکھنے والے کیمپوں کی رہی، اور کچھ ایک ایسی قلیت کی، جو مجبور تھی کہ اپنے گردوپیش کے حالات کے ساتھ نباہ کر رکھے مسلمان فاتح کثیر التعداد ہندو آبادی کو محکوم بنا کر تو رکھ سکتے تھے، لیکن اپنی قلتِ تعداد کی وجہ سے وہ یہ نہیں کر سکتے تھے، کہ اس آبادی کو اپنے اندر جذب کر لیں

له پاکستانی

بات یہ ہے کہ اسلام کو جہاں کہیں بھی اس کی فتوحات کا سیلاب پہنچا، یا تو ایسی قوموں سے سابقہ پڑا جو سیاسی لحاظ سے غیر منظم تھیں، یا ایسے لوگوں سے اسے پالا پڑا جو تمدنی لحاظ سے پس ماندہ تھے، اور ان دونوں قسم کے گروہوں نے بڑی آسانی سے اسلام کی نئی حکومت اور اس کے نئے نظام کو قبول کر لیا۔ لیکن اس کے برعکس ہندوستان میں اسلام کا مقابلہ ایسے لوگوں سے پڑا جو تہذیب اور اپنے فلسفیانہ کلچر میں مسلمانوں سے بہت آگے تھے، چنانچہ اس کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان کو اسلام صرف اپنی فوجی طاقت کے بل پر مسخر کر سکا اور مسلمان فاتحین کو مجبوراً ہندو "بت پرستوں" سے سمجھوتہ کرنے کی ضرورت پڑی۔ اس دوران میں جو ہندو مسلمان ہوئے، ان کے مسلمان ہونے کی ایک وجہ تو دنیاوی منافع تھے کیونکہ ان نومسلموں کی غالب اکثریت پس ماندہ طبقوں سے تعلق رکھتی تھی جو دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد دوسرے انسانی بھائیوں کے برابر ہو جاتے اور اپنی ذلیل حالت سے گلوخلاصی حاصل کر لیتے تھے چنانچہ اسلام نے اور ملکوں کی طرح یہاں بھی اپنی جمہور دوستی کی رُوح کو انسانی آزادی کا عملی ذریعہ ثابت کیا۔ ہندوستان کی مسلم آبادی عرب، افغان، ایرانی، ترکی اور زیادہ تر مقامی عناصر سے مل کر وجود میں آئی ہے، اور اس میں سنیوں کی اکثریت ہے، یعنی ۹۳ فی صد اور شیعوں کے دونوں فرقے پائے جاتے ہیں (اثنا عشری اور اسماعیلی) اسماعیلی خوجے اور بوہرے بہت امیر اور اپنی مذہبی تنظیم کے بڑے وفادار ہیں، اور مسلمانوں کی زندگی میں ان کا بڑا اہم کردار ہے۔ اسماعیلی خوجوں

کا مذہبی سربراہ آغا خاں ہے، جو اسماعیلی امام کا جانشین اور زمین پر خدا کی زندہ نشانی ہے۔ موصوف کا شمار ہندوستان کے سب سے زیادہ پڑھے لکھے اور سب سے بڑے دولت مندوں میں ہوتا ہے۔ وہ انگریزی زبان میں سیاست پر کتابیں لکھتے ہیں وہ یورپ میں رہتے اور اس کی جملہ آسائشوں سے بہرہ ور ہوتے ہیں آپ نے یورپی عورتوں سے شادی کی ہے، اور گھوڑ دوڑ کے تیز ترین گھوڑوں کے مالک ہیں۔ ان کے معتقد ان کا بے حد احترام کرتے ہیں، اور ان کو ایک مافوق العادت شخصیت مانتے ہیں۔ اور کافی بڑی مقدار میں ان کے خزانے میں نذرانہ جمع کرتے ہیں الغرض عملاً ایک دوسرے کے محتاج، لیکن اصلاً ایک دوسرے سے مختلف ہندو اور مسلم رجحانات کے ملاپ کا اس قسم کا مبہم نمونہ ہندوستان کی تاریخ میں بار بار ہمیں دیکھنے میں آتا ہے، بعض جگہوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ مقدس مقامات ہیں۔ اور بعض اضلاع میں مسلمان گائے کا گوشت نہیں کھاتے اس لئے کہ ہندو اسے مقدس سمجھتے ہیں۔ مسلمان راجپوتوں میں یہ رواج ہے کہ ان کی شادیوں کی رسوم مسلمان مولویوں اور ہندو برہمنوں کے ہاتھوں یکے بعد دیگرے سرانجام پاتی اور بعض ایسی مسجدیں ہیں، جہاں اب تک وہ زنجیر نظر آتی ہے جس میں گھنٹی بندھی ہوتی تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لوک گیت ہندو مواد سے بھرے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کی زبان یعنی اردو جس کے معنی فوجی

لشکر کی زبان کے ہیں، مجموعہ ہے عربی اور فارسی الفاظ کا۔ جس کی کہ بنیاد ہندی گرامر ہے۔ کلچر اور خون کے اس غیر معمولی اختلاط کا نتیجہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں میں رنگ و نسل کا کوئی امتیاز نہیں جہاں ایک طرف ان میں اچھا خاصا سفید رنگ مغل ملتا ہے، وہاں اس کے ساتھ کالے رنگ کا مدراس کا تیلگو بولنے والا بھی ملے گا) یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ اسلام کے متعلق ہندوستانی مسلمانوں کا نقطہ نظر ایک نہیں۔ اس وقت ہندوستانی مسلمان دو پتھروں کے نیچے پس رہے ہیں۔ ایک تو یورپی تسلط کی تکلیف دہ یاد اور دوسرا ہندو قومیت۔ ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ پاکستان کی نئی مملکت اسلام کی اجتماعی اور سیاسی تاریخ میں ایک سیر حاصل دور کو وجود دے گی۔

انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ناکامی کے بعد اسلامی ہند مدافعت کے لئے پیچھے ہٹ آنے پر مجبور ہو گیا۔ ۱۸۶۰ء میں بعض مسلمان اکابر کو اس افسوسناک صورت حال کا احساس ہوا، اور ان میں بیداری کی لہر اٹھی۔ سر سید احمد خاں پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے قوم سے چندہ جمع کیا اور اپنی ان تھک محنت سے

نہ اس احساس بلکہ اس حقیقت نے تحریکِ پاکستان کو جنم دیا اور متحدہ ہندوستان کے دس کروڑ کے دس کروڑ مسلمان اس کے دالہ اور شیفتہ ہو گئے، اور پاکستان کی آزاد اسلامی مملکت کا حصول اسلامی ہند کا واحد قومی نصب العین بن گیا۔ مترجم

اپنے ہم مذہبوں کو اس روحانی اور اقتصادی جمود سے، جس میں وہ محض اپنی غفلت کی وجہ سے گرفتار تھے، نکالنے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لئے علی گڑھ میں ایک کالج قائم کیا۔ اس کالج میں اسلام کے وقار کا پورا خیال رکھتے ہوئے یورپی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ سر سید کی ان کوششوں کو شروع شروع میں طعن و تشنیع اور مخالفتوں کا نشانہ بنایا گیا، لیکن انہوں نے ان سب کا کامیابی سے مقابلہ کیا۔ آج یہ کالج یونیورسٹی ہے اور یہاں مسلمان دانشور نوجوان تربیت پاتے ہیں

ہندوستانی اسلام کو جو غدر کے بعد اپنی مدافعت پر مجبور کر دیا گیا تھا، آخر کار ایک شریف النفس اور بلند پایہ حمائتی مل گیا۔ سید امیر علی نے اپنی تاریخی تصنیفات یورپی مصنفین کی کتابوں کے جواب میں لکھیں جو کہ تجزیہ و تحلیل کے اصول پر لکھی گئی تھیں، اور اکثر بے روح تھیں۔ سید امیر علی کی تصنیفات یورپی قومیت کے جذبے کے ماتحت لکھی گئی تھیں۔ اس کے ساتھ سید امیر علی نے اپنے ہم وطنوں کے سامنے اس حقیقت کو بھی وا شگاف کرنے کی کوشش کی کہ مغلوں کا دور ختم ہو چکا اور اب اگر انہوں نے یورپی اسلحہ سے لیس ہو کر اپنی مدافعت نہ کی تو زندگی کے یورپی طریقے ان کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر پھینک دیں گے۔ سید امیر علی کے نقش قدم پر چلنے والے ہندوستان میں آج بہت سے ہیں، اور ان میں سر محمد اقبال مرحوم کا مقام سب سے بلند ہے۔ جو ایک صاحب الہام شاعر اور فلسفی تھے اور جنہوں نے اسلام

کو نئی زندگی دینے کے لئے بڑی جرأت سے جدوجہد کی۔

ہندوستان کے مسلمانوں میں کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ قومی شعور بیدار ہوا ہے۔ ان کے ایک مختصر گروہ نے۔ ہندو مسلم اتحاد کی وکالت کی جس کا آغاز ۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت کے نتیجے کے طور پر ہوا تھا۔ اس گروہ نے ۱۹۳۶ء میں ڈاکٹر انصاری کی زیر ہدایت کانگریس کی سرگرمیوں میں شرکت کی اور ہندوستانی قومیت کے اصول کو اپنایا۔ دہلی مسلم یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کے طالب علم سفید گاندھی ٹوپی پہنتے تھے[1] ان کی یہ کوشش تھی کہ مذہبی اختلافات دور کرنے کے مشکل کام کو آسان بنائیں اور اس طرح قومی ہندوستان کو جنم دیں۔ اس دردمندانہ لیکن بے نتیجہ کوشش سے قطع نظر، ہندوستانی مسلمان ہمیشہ سے جارحانہ اور دفاعانہ "پان اسلامزم" کے بڑے پُر یقین سپاہی رہے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب تمام اسلامی ملک اپنے ہاں قومیت کو فروغ دے رہے تھے، اسلامی ہند اس مذبذب میں تھا کہ کہاں جائے اور کدھر کو جائے؟ کشمیر میں ۹۲ فی صد ان پڑھ مسلمانوں پر ایک ہندو مہاراجہ اپنے پنڈتوں کی مدد سے حکومت کر رہا ہے[1]، اور اس کے برعکس حیدرآباد میں ۸۹ فی صد شمالی ہند کے مسلمان سرکاری عہدوں پر قابض ہیں۔ اور وہاں فرمانروا مشہور نظام دنیا کا سب سے دولت مند اور سب سے سادہ آدمی ہے حیدرآباد کی سرکاری زبان اردو ہے۔ جو زبان کی آبادی کے لئے جو

---

[1] یہ تمام کی تمام باتیں قیام پاکستان سے پہلے کی ہیں

تیلگو، کناری اور مرہٹی بولتی ہے بکل طور پر اجنبی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب اردو ہندوستان کی بین الصوبائی زبان (لنگوا فرانکا) تھی، اب اس کی جگہ تبدریج انگریزی نے لے لی ہے۔ ہندوستانی مسلمان بڑی سختی سے سیاسی تحفظات سے چمٹے ہوئے ہیں تاکہ ہندوستان میں ہندو اکثریت کے مقابلے میں ان کے حقوق محفوظ رہیں، جس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہندو انہیں ایک دن انگریزوں کی طرح اجنبی سمجھنے لگیں۔ یہ ہیں وہ حالات جن کی بنا پر آج قابلِ نفرت انگریز اور مغرور مغلوں کے وارث ایک دوسرے کے حلیف ہو گئے ہیں۔

اسی سلسلے میں علامہ محمد اقبال نے یہ تجویز پیش کی کہ شمالی ہند میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اسے ہندو اکثریت والے علاقوں سے جدا کر لیا جائے۔ ہندوستان کی اس تقسیم سے ایک مسلم انتظامی وحدت وجود میں آگئی ہے۔ لیکن اس مسلم انتظامی وحدت کا یہ وسیع حصہ ملک بھی، سندھی، پشتو، اور پنجابی زبانیں بولنے والے چھوٹے چھوٹے علاقوں میں منقسم ہے جو مختلف قبائل، نظامِ معاشی اور تہذیبی درجات میں بٹے ہوئے ہیں۔ (علامہ) اقبال کی یہ تجویز پاکستان کی شکل میں آج حقیقت واقعی بن چکی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دور دراز بنگال کا کیا ہوگا؟ جہاں ساڑھے چار کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ جو صرف بنگالی سمجھ سکتے ہیں اور اسی طرح کشمیری مسلمانوں کا کیا ہوگا؟ مسلم لیگ اور حکومت پاکستان کو یہ اہم مسائل طے کرنے ہوں گے۔ ایک نئی اسلامی مملکت وجود میں آچکی ہے

اور یہ بڑی جرأت سے اپنے باشندوں کے حقوق کی وکالت کر رہی ہے۔ یقیناً یہ اسلامی کلچر اور اسلامی قوت کے لئے ایک مضبوط قلعہ ثابت ہو سکتی ہے۔

مصر میں یورپی نوآبادیاں، وہاں کے مسلمانوں اور قبطیوں پر یورپ کے معنوی اور معاشی تسلط کی نمائندگی کرتی ہیں۔ مصر کے موجودہ شاہی خاندان[1] کے مورث اعلیٰ محمد علی پاشا نے سب سے پہلے طالب علم یورپ بھیجے، نیز اس نے قاہرہ میں میڈیکل اور فوجی سکول قائم کئے۔ اس کے پوتے خدیو اسماعیل نے جو بڑا فضول خرچ لیکن اعلیٰ تہذیب اور کلچر کا مالک فرماں روا تھا، یہ اعلان کیا کہ مصر یورپ کا ایک حصّہ ہے۔ اس نے اپنے جانشینوں کو صرف بے انداز قرضوں کا بوجھ جس کی وجہ سے اسے ہمیشہ ملعون کہا جاتا ہے ورثے میں نہیں دیا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ فضا بھی دی جس سے موجودہ مصر کا کلچر نشو و نما پذیر ہوا ہے۔

مصری قوم پرستی کا پہلا نقیب نپولین تھا جس نے مصر پر حملہ آور ہوتے وقت اپنے ایک جنگی جہاز میں عربی زبان کے چھاپہ خانے سے مصریوں کے نام اس مضمون کا مشہور اعلان طبع کیا تھا، جس میں اُن سے کہا گیا تھا کہ وہ اجنبی مملوک حاکموں کے جوئے غلامی کو اتار پھینکیں اور

---

[1] اس خاندان کا آخری فرماں روا شاہ فاروق تخت و تاج سے دست بردار ہو کر یورپ میں جلا وطنی کے دن گزار رہا ہے اور مصر ایک فوجی آمریت کے تحت ہے

آزادی خواہ لوگوں کے ساتھ تعاون کریں۔ نپولین نے اپنے مختصر سے زمانۂ قیام میں مصری کلچر کو کہیں زیادہ ترقی دی بمقابلہ اس کے جتنی ممالیک نے کئی صدیوں میں دی تھی۔ نیز اس نے وہاں جو سائنسی ادارے قائم کئے اور ان سے جو مطبوعات شائع ہوئیں۔ انہوں نے سچ یہ ہے مصر کے مدفون ماضی کو دنیا کے سامنے لانے اور اسے یورپ سے قریب تر کرنے میں بڑا کام کیا۔ مصر میں عربی ادب نے بھی یورپ کے اثرات کے ماتحت ہی نئی زندگی پائی۔

ایرانی سیاست کے مرد میدان سید جمال الدین افغانی نے مصر میں سیاسی جدّ و جہد کا پہلے پہل بیج بویا۔ موصوف جامعہ ازہر میں جو جمود کی گہری نیند میں سوئی پڑی تھی۔ جغرافیہ پڑھانے کے لئے کرہ زمین (گلوب) لے کر گئے تاکہ اہل جامعہ کو خواب غفلت سے جگائیں۔ سید جمال الدین افغانی نے اسلامی اعمال و عبادات کو خلفاء راشدین کی سنت تک محدود کرنے کی کوشش کی آپ کے دماغ میں امام غزالی کی روشن خیالی روحانی حکمت تھی جس کے ساتھ سیاسی آزادی کے جذبات مل گئے تھے۔ آپ کے شاگرد عقلیت پسند اور منتقی و متدین شیخ محمد عبدہ نے اپنے مقالات نیز اپنی تفسیر القرآن میں روح اسلام کو بیسویں صدی کے سائنسی معیار سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی، گو ان کی یہ کوشش بارہا ٹھوکر دل اور تضادات سے دوچار ہوئی، لیکن اس نے وہ رَو ضرور پیدا کردی جو مصر کے ادیبوں

طبقوں کو معنوی اعتبار سے "لبرل ازم" اور سیاسی نقطۂ نظر سے قوم پرستی کی طرف لے جانے کا باعث بنی۔ عرابی پاشا کی بغاوت کو ۱۸۸۲ء کچلنے کے بعد مصر پر قابض برطانیہ نے مصر کو براہِ راست یورپ سے متصل کر دیا۔ مصر کے یورپ کے ساتھ اس براہِ راست اتصال سے دو نتیجے نکلے۔ ایک تو یہ کہ اجنبی تسلط کی وجہ سے آزادی خواہ ادب اور دستوری حکومت جو اس زمانے میں یورپ میں فروغ پر تھی، مصری دماغوں کو اُن سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ اس سے ان میں تحقیق و جستجو کا جذبہ پیدا ہوا اور دوسرے یہ کہ ان کے اندر اجنبی تسلط کے خلاف حب الوطنی کا جذبہ مقاومت بھڑک اٹھا۔

آج مصری اخبارات اور رسائل قدیم عربی کتابوں اور قدیم مسلمان اہلِ قلم کے مقابلے میں کہیں زیادہ یورپ کے ادبی اور سائنسی مسائل کو اپنا موضوعِ بحث بناتے ہیں۔ والٹر۔ گوئٹے، سپنگلر اور دوسرے فرانسیسی مصنفوں پر مصر کے ادبی اور علمی حلقوں میں جو لیکچر دیئے جاتے ہیں۔ ان میں بکثرت لوگ شریک ہوتے ہیں۔ ان شریک ہونے والوں کی صفوں میں ہم جامعہ ازہر کے عمامہ پوش طالب علم بھی دیکھتے ہیں، جو اگرچہ بڑے غور سے یہ لیکچر سنتے ہیں۔ لیکن اس میں شک ہے کہ وہ ان لیکچروں کی معنویت پر دسترس بھی پا سکتے ہیں یا نہیں۔ دراصل ان لیکچروں کو پوری طرح سمجھنے کے لئے کافی عمیق تمہیدی

مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اس سے زیادہ کی تمنا کہ ازہر کے علیحدگی پسند ماحول میں اس وقت ممکن ہے۔ بہرحال ان طالب علموں کا ذوق و شوق اور ان کا جذبۂ تحقیق و جستجو ایک بہت حوصلہ افزا علامت ہے۔ اس کے علاوہ مصر کے وہ لوگ جو یورپی اسکولوں کے فارغ التحصیل ہیں اور فرانسیسی اور انگریزی بڑی اچھی طرح سے بولتے ہیں، یورپی ادب کو بے حد رغبت سے پڑھتے ہیں۔ یہاں تک کہ اکثر اس کی وجہ سے مصری اہل قلم خسارے میں رہتے ہیں۔ اس رجحان نے مصریوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک گروہ جو صرف عربی جانتا ہے اور جو صرف قدیم کلاسیکی ادب کی تقلید سے لذت یاب ہوتا ہے۔ اور دوسرا گروہ نئے موضوعات کا رسیا ہے اور وہ گھسے ہوئے عام مذاق کے انداز بیان سے تنگ آ چکا ہے۔ مصری قوم پرستی، ایرانی اور ترکی قوم پرستی کی طرح عربی آئیڈیل (مثالی تصورات) کے ساتھ ساتھ قدیم مصری ذہنیت کو بھی ترقی دینا چاہتی ہے اور اس میں فراعنہ کے عظمت و جلال کا بھی اتنا ہی حصہ ہوگا۔ جتنا عمرو بن العاص مصر کے مسلمان فاتح کا۔

مصر کے نئے لکھنے والوں کی بدولت عربی زبان نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ لچک دار اور زبردست اظہار بیان کی مالک عربی زبان میں یہ صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے کہ دوسری زبانوں کے مانگے تانگے الفاظ کے بغیر موجودہ زندگی کے ہر منظر کو بیان کر سکے۔ لیکن جدید

عربی ادب میں ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ آیا مصنفین اس زبان میں لکھنا شروع کر دیں، جو عام طور پر بولی جاتی ہے، یا وہ بدستور اسی کلاسیکی زبان میں لکھتے جائیں جو وہ صرف منبروں سے خطبے دیتے وقت بولتے ہیں، اس مسئلے کا اثر بہت دور تک جاتا ہے۔ جہاں تک کلاسیکی زبان کا تعلق ہے وہ تمام عربی بولنے والے مسلمانوں کو ملاتی ہے۔ لیکن عربی ملکوں کی جو مقامی بولیاں ہیں، وہ قریب کے ہمسایہ علاقے تک مشکل سمجھی جاتی ہیں۔ چنانچہ اگر ان مقامی بولیوں کو ادبی زبان بنایا گیا تو اس سے عربی دنیا کی تہذیبی وحدت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ بہر حال اب جوں جوں تعلیم عام ہو رہی ہے اس کی وجہ سے عربی کلاسیکی زبان کا دائرہ بھی بڑی تیزی سے وسیع ہو رہا ہے۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ اس طرح کلاسیکی اور روز مرہ کی زبان کا یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ مصر میں ادبی اور بولنے کی الگ الگ زبان ہونے کی وجہ سے ڈرامائی ادب کو بہت زیادہ نقصان پہنچ رہا ہے۔ قاہرہ اور اسکندریہ میں تھیٹروں کی اسٹیجوں سے کلاسیکی عربی زبان کا انداز بیان بہت عجیب لگتا ہے۔ اس لئے کہ روزمرہ کی زندگی میں اس زبان کو کوئی نہیں بولتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مصنفین زندہ کرداروں کو تھیٹر کی اسٹیج پر لانے سے قاصر رہتے ہیں۔ باقی رہا میوزک ہال یعنی طرب خانوں کا معاملہ جہاں مقامی زبانوں میں گانے گائے جاتے ہیں تو وہ اتنے پست درجے

گئے ہیں کہ ان سے تعلیم یافتہ طبقے کے ذوق کی کسی طرح بھی تسکین نہیں ہو سکتی۔

یورپ کی زبانوں نے تو وہاں کے لوگوں کی تعلیم کے ساتھ درجہ بدرجہ ترقی کی، لیکن اس وقت مشرق کی کیفیت یہ ہے کہ ایک مختصر سا تعلیم یافتہ طبقہ باقی لوگوں سے بہت اونچا اور بہت دور ہے چنانچہ مصنف قارئین کے اس ایک بہت ہی مختصر گنے چنے گروہ پر آس لگائے رہتے ہیں۔ اور خالص ادبی تصانیف کے مقابلے میں عام مذاق کی کتابیں بہت کامیاب رہتی ہیں۔ مصر بجا طور پر آج عربی ادب کی قیادت کا حق دار ہے۔ گو اس کے پہلی صف کے اہل قلم میں بہت سے شامی ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جہاں شعرا اپنے پرانے اور نئے اسلوب میں بھی اپنی منظومات پیش کر رہے ہیں، وہاں عربی ناول نگاری کو اب تک سازگار فضا میسر نہیں آئی۔ جرجی زیدان ایک شامی۔ مصری مورخ نے تاریخی ناول لکھنے کا بے شک تجربہ کیا لیکن نہ وہ اور نہ مویلح ناول نگاری میں بعض ترکی ناول نگاروں کے درجے تک پہنچ سکے۔ ابھی حال میں اس فن میں حسین ہیکل کا ناول زینب جس کا موضوع مصر کی دیہاتی زندگی ہے اچھا خاصہ کامیاب رہا لیکن اس کے بعد مصنف نے اپنی اس کوشش کو جاری نہیں رکھا۔ توفیق الحکیم نے ادبی زبان اور کلاسیکی زبان کو اپنے ناول "عودۃ الروح" میں باہم سمونے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی

یہ حکایت زیادہ کامیاب نہیں رہی ۔ البتہ مختصر افسانے ناولوں سے کہیں زیادہ کامیاب رہے ہیں ۔ افسانہ نگاری میں اس وقت چوٹی پر محمود تیمور ہیں، جو بڑا احساس دل اور نکتہ رس دماغ رکھنے والے اہل قلم ہیں، ان کا شستہ مذاق اور آسان اور سادہ زبان آنے والی نسلوں کے لئے ان کو قابلِ تقلید نمونہ بنا دے گی ۔ طاہر شین، المازنی اور لبین حسونہ اپنے افسانوں میں مصری زندگی کے اجتماعی مسائل کی پہنائیوں میں گئے ہیں اور ان کی تصنیفات خاص مصری موضوعات پیش کرتی ہیں ۔

ابن سعود نے فقہ حنبلی کی بعض دینی کتابیں نئے سرے سے چھپوا کر خالص کلاسیکل عربی ادب کی حوصلہ افزائی کی ۔ اس کے علاوہ علمی اور شاعرانہ ادب کو بھی موصوف کی سرپرستی نصیب ہوئی ہے ۔

شمالی افریقہ کلچر کی نئی راہوں پر فرانسیسی تسلط کے زیر اثر گام زن ہوا ہے ۔ گو اس کی رفتارِ ترقی بڑی سست ہے لیکن وہ رکی نہیں ۔ وہاں کے تعلیم یافتہ طبقوں کی الماریوں میں آپ کو مصری اور شامی مصنفین کی عربی کتابیں ملیں گی ۔ اب جہاں ایک طرف مشرق میں اسلام آگے بڑھ رہا ہے اور آبادیوں کے مختلف عناصر میں باہمی ربط و ضبط کا نیا ذریعہ پیدا کر رہا ہے ۔ وہاں دوسری طرف وسطی افریقہ اور انڈونیشیا میں جہاں کے لوگ زیادہ تر ان پڑھ ہیں اور بے جان چیزوں کو ذی روح مان کر پوجنے والے ہیں، راسخ العقیدہ اسلام خوب بار آور ہو رہا ہے ۔ ان لوگوں کے لئے مذہب اسلام زبردست اجتماعی اور روحانی ترقی کا ذریعہ ثابت ہوا ہے ۔ افریقہ میں اسلام

کے معتقدین کو متقی اور نیک شخصیتیں منظم کرتی اور ان کو تصوف کے ذریعہ اپنے اردگرد جمع کر لیتی ہیں۔ اس کے بعد وہ ان لوگوں کی وجدانی طور پر خالقِ کائنات کی ذات کی طرف رہنمائی کرتی ہیں، جو کہ علم و ادراک سے ماوراء ہے۔

بکتاشی بزرگ حضرت گُل بابا جو آج بوڈاپسٹ میں اپنے مزار کے قُبّے کے نیچے محوِ استراحت ہیں، اور جن کا جنازہ ترکی سلطان سلیمان اعظم نے خود اپنے کندھوں پر اٹھایا تھا، ہمیں یہ بات یاد دلاتے ہیں کہ سب دنیا وی چیزیں بدلنے والی اور زوال پذیر ہیں۔ اس سرزمین میں موصوف کا مزار ہی اب اس امر کی نشانی رہ گیا ہے کہ اسلامی فوجیں فتوحات کرتی کبھی یہاں تک پہنچی تھیں۔ حضرت گل بابا کے اس شکستہ سنگین مزار کے سوا مسلمانوں کے یہاں اور کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ یہ واقعہ یورپ کے موجودہ کلچر اور اس کی تہذیب کے لئے بھی ایک تنبیہ کا حکم رکھتا ہے۔ جو آج بظاہر اس قدر مضبوط اور توانا نظر آتی ہے۔ لیکن جسے اس وقت بڑے سخت، اہم اور خوفناک خطرات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

ضمیمہ[1]

اسلام کا تاریخی کارنامہ

"قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں کس طرح مختلف قومیں اور تمدن آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے اور ہر قوم اپنے آپ کو کافی بالذات اور مستغنی عن الغیر سمجھتی تھی۔ عیسائی کہتے تھے کہ جو عیسائی نہیں وہ انسان ہی نہیں، اسی طرح یہودیوں نے اپنے آپ کو سب سے جدا کر لیا تھا، ایرانی اپنی جگہ مگن تھے، اور ہندوستان والوں نے سمندر پار دیکھنا تک حرام بنا رکھا تھا۔ اس وقت دنیا کی یہ حالت تھی جیسے چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں پانی رک گیا ہو۔ اور ایک گڑھا دوسرے سے جدا ہو اور سب الگ الگ سڑ رہے ہوں۔ عربوں کی ایک نئی قوم ایک سیلاب کی طرح نازل ہوئی اور انہوں نے سب گڑھوں کو ایک کر دیا۔ اور ساری نوعِ انسانی الگ الگ گڑھوں کے بجائے ایک ذخار سمندر بن گئی اور سب قوموں کے ذہنی اور فکری دھارے اس میں گرنے لگے اور اس طرح مجموعی طور پر انسانیت کو آگے بڑھنے کا موقعہ ملا۔

اسلامی تہذیب کا بنیادی اصول۔ انتخابیت

"عرب ان پڑھ تھے۔ انہوں نے سب قوموں کے علوم کو سر آنکھوں پر لگایا۔ ان کا کوئی بندھا ٹکا نظام تمدن نہ تھا۔ انہوں نے سب قوموں کو کھنگالا اور "خذ ما صفا ودع ما کدر" پر عمل کرتے ہوئے سب تمدنوں کے اچھے پہلو لے"۔ اسی طرح انہوں نے عیسائیت، یہودیت، مجوسیت

[1] دیکھئے مقدمہ صفحہ ۳۲۔ یہ اقتباسات افکار و تعلیمات مولانا عبید اللہ سندھی سے لیے ہیں۔ کتاب مذکور ۱۹۴۲ء میں چھپی تھی اور پروفیسر جرمانوس کا یہ مقالہ ۱۹۳۸ء کے قریب کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

اور صابئیت سب کو ایک آنکھ سے دیکھا اور سب کو برملا طور پر کہہ دیا کہ انسان خواہ کوئی بھی ہو۔ جو انسانیت کے بنیادی اصولوں کو مانتا ہے وہ اچھا انسان ہے۔ تمام نسل، رنگ، اور گروہوں کے امتیازات سب باطل ہیں"

اسلامی تہذیب کی عالم گیریت

"مسلمانوں نے اسلام کے عالم گیر انقلاب پر بعد میں ایک عالم گیر تمدن انسانی کی بنیاد رکھی اِدھر بغداد میں اور اُدھر قرطبہ میں مشرق اور مغرب کی تمام قوموں اور ان کے افکار و مذاہب کا اجتماع ہوا۔ ہر نسل کے لوگ آپس میں ملے ایک دوسرے کے خیالات سے واقف ہوئے ایک زبان کے علوم دوسری زبان میں ترجمہ ہوئے۔ ہندوستان کی طب و حکمت، یونان کے فلسفے، اسکندریہ کے علوم ایرانیوں کا ادب، یہودیوں اور عیسائیوں کی روایات مذہبی اور عربوں کی زبان اور دین سے انسانی تمدن کی ایک نئی حیثیت کی ترکیب عمل میں آئی جو ماضی کے سارے علوم و فنون اور حکمت و فلسفہ کا نچوڑ تھا۔ اور حال و استقبال کے لئے مشعل راہ۔

یہ تھا اسلام کا تاریخی کارنامہ اور انسانیت مسلمان کے اس احسان کو کبھی نہیں بھول سکتی اسلام کے اس تاریخی کارنامے کی روح اس کی عالم گیریت اور جامعیت تھی۔ مسلمانوں نے سب مذہبوں اور تمدنوں کو اصلاً ایک سمجھا اور ان کی مذہبی کتاب نے ساری انسانیت کو مخاطب کیا ان کے مفکروں نے علم و فلسفہ پر بحث کی تو سب قوموں کے ذہنی سرمایہ کو چھان ڈالا اُن کے مؤرخ تاریخ لکھنے لگے تو انہوں نے حضرت آدم سے شروع کر کے ساری قوموں کی تاریخ کو ایک زنجیر کی کڑیاں بنا کر پیش کیا"۔

زوال کے اسباب

"ہر قوم جو اپنے زمانۂ تاریخ میں فکر و عمل کی دنیا میں بین الاقوامی قیادت کی مالک بنی ہیں

کا طرۂ امتیاز تھی یہی عالمگیریت اور جامعیت تھی اور پھر جب اس قوم کے مٹنے کے دن آئے تو ان کی نظریں تنگ ہو گئیں اور ان کے دماغ اور بھی تنگ ہو گئے، اور انسانیت کا بین الاقوامی تصور تو الگ رہا، ان کے ذہنوں میں اپنی پوری قوم کی سمائی بھی مشکل ہو گئی۔ وہ انسانیت سے قومیت پر آ گئے، اور قوم سے اپنی فرقے بن گئے اور آخر فرقوں میں بھی آپس ہی میں مال بٹنے لگی اور نفسی نفسی تک نوبت پہنچ گئی۔ یہودیوں کے ساتھ یہی ہوا، عیسائی اسی روگ میں مبتلا ہوئے اور آج مسلمان کا بھی یہی حال ہے۔"

یورپ کی مادی ترقی

یورپ کی مادی ترقی اور معاشی تنظیم کا مفید اور کارآمد ہونا تو اب کسی دلیل کا محتاج نہیں رہا۔ اس مادی ترقی کے طفیل افرنگ کا ہر قریہ فردوس کی مانند بن گیا ہے۔ قدرت کے سارے خزینے انسان کی دسترس میں آ گئے ہیں اور خشکی، تری اور ہوا پر اس کا سکہ رواں ہے۔ معاشی تنظیم کے سلسلے میں بہت کچھ ہو چکا ہے اور بہت کچھ اس جنگ (دوسری جنگ عظیم) کے بعد لازمی طور پر ہو گا۔ مادی ترقی نے فراوانی بہم کر دی۔ اب معاشی تنظیم اس فراوانی کو سب کے لئے عام کرنے میں لگی ہوئی ہے۔"

ہم شکست کھا گئے[1]

نیا دور[2] ہمارے لئے بہت سی مصیبتیں لایا۔ ہم اس ملک کے مالک تھے، آج ہم دوسروں کے غلام ہیں۔ ہم صدیوں تک یہاں سیاسی اقتدار اور معاشی ثروت کی باگ ڈور تھامے رہے، آج ہم محروم ہو گئے۔ ہمارے اسلاف علم و فضل کے محافظ تھے، آج علم و فضل دوسروں کے ہاں جا چکا ہے۔ ہم آسمان پر تھے، لیکن تقدیر نے آج ہمیں گڑھے میں دھکیل دیا ہے

---

[1] یہ کیسے ہوا؟ پروفیسر جوڈ نے اس ذہنی پستی کے مادی اسباب بڑی تفصیل سے اصل مقالے میں بتائے ہیں۔ مترجم

[2] یہ تحریر ۱۹۴۰ء سے بہت پہلے کی ہے۔ مترجم

ہم واقعی شکست کھا گئے ہیں ہمیں اس شکست کا کھلے دل سے اعتراف کر لینا چاہیئے لیکن یہ شکست ہمارے تمدن اور نظام کی شکست ہے ہمارے فکر کی شکست نہیں اس فکر نے ایک زمانے میں یہ ڈھانچہ اختیار کیا اب وہ ڈھانچہ ٹوٹ چکا ہے جہاز ڈوبنے کے بعد محض اس خیال سے کہ کبھی یہ جہاز ہمارا تھا اور اس کے بل پر ہم سمندر کے سینے پر دوڑے پھرتے تھے جہاز کے تختوں سے چمٹے رہنا دانش مندی نہیں ۔

اصلاح احوال کی صحیح راہ

اس بات کو تسلیم کرنے میں ہمیں باک نہیں ہونا چاہیئے کہ ہماری سیاست، ہمارا تمدن اور ہمارا قانون ایک زبردست قوت سے شکستہ ہو چکا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ عرصہ دراز تک ہماری قومی شخصیت نے اپنے آپ کو ان علمی اور عملی مظاہر میں جلوہ گر کیا ہے ۔ اور یہ چیزیں ہمارے قومی وجود کے لیئے ایک حد تک لازمی ہو چکی ہے ۔ اس لئے ان کا کلی انکار کسی طرح ممکن نہیں یہ علمی و عملی آثار ہماری قومی تاریخ کا ایک حصہ بن چکے ہیں ہمیں چاہیئے کہ ماضی کی اس وراثت کا پورا پورا جائزہ لیں ۔ کھوٹے کو الگ کر دیں ۔ اور جو کھرا ہے اسے ہیں اور موجودہ زندگی کے تقاضوں کے ساتھ جن کا انکار کسی صورت ممکن نہیں کیونکہ ان کا انکار کر کے ہم زندہ نہیں رہ سکتے اس کھرے حصے کو ہم آہنگ کریں ۔

یورپ کا صنعتی انقلاب

:- موجودہ یورپی انقلاب آئندہ کے عالمگیر انسانی انقلاب کا پیش خیمہ ہے

ہمیں اس انقلاب کو اپنا لینا چاہیئے یہ لازم نہیں آتا کہ یورپ والوں کی نظر صرف مادیت تک محدود ہو کر رہ جائے ۔ بلکہ دیکھا جائے تو خود یورپ والے مادی انقلاب سے آگے بڑھ کر ایک انقلاب کے لئے زمین ہموار کرنے میں لگے ہوئے ہیں ضرورت ہے کہ ہم مادی زندگی کی اس تنظیم کو بجنسہٖ قبول کر لیں اور عالمگیر آزادی اخوت اور معاشی مساوات کو اپنی زندگی کا اساس بنائیں اس سے دین سے قطع تعلق کرنا ضروری نہیں ہوگا بلکہ سچ پوچھئے تو یہی سچے دین کی تمہید ہے

کابل میں سات سال

از مولانا عبیداللہ سندھی مرحوم

۱۹۱۵ء میں جب پہلی جنگ عظیم زوروں پر تھی، مولانا مرحوم دھلی سے کابل پہنچے، تاکہ وھاں سے ایک تو ترکی کی مدد کی جائے اور دوسرے ہندوستان کو آزاد کرانے کی کوشش ھو۔

اس سلسلے میں ترکوں، جرمنوں، افغانوں نیز آزادی خواہ "ہندوستانیوں" نے جو کچھ کیا، نیز افغانستان کے شاہی خاندان کی درون پردہ سیاست اور اس زمانے کے بین الاقوامی جوڑ توڑ۔

یہ سب کچھ مولانا نے اپنی آنکھوں سے دیکھا مرحوم کی یہ خود نوشتہ روئداد ھماری تاریخ کے اس نازک ترین دور کا مرقع ھے۔

قیمت ۱/۴

سندھ ساگر اکادمی ۰ لاہور

مطبوعہ رہبر پریس، لاھور